اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۳ء)

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۳ء)

اقبال ریویو

زیر اہتمام

اقبال اکیڈیمی ، حیدرآباد ، انڈیا

جلد (۲۳) شمارہ (۱)

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)
۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)
۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۷۵ روپے
ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۱۵۰ روپے
بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔حیدرآباد۔500028
آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A
نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔فون:9392427796

ISBNNo: 81-86370-54-4

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے۔لیس کے، گرافکس حمایت نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

(اقبال ریویو۔اپریل۲۰۱۳ء)

۱	اداریہ	ادارہ	۴
۲	نالہ یتیم	اقبالؔ	۶
۳	فریادامت	اقبالؔ	۱۸
۴	اقبال وجمیل	ڈاکٹر منظر اعجاز	۳۴
۵	اقبال اور وحدت اسلامی	رانا غلام شبیر	۵۲
۶	اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل نو	ڈاکٹر زاہد منیر عامر	۶۳
۷	اقبال اور عظمت آدم	ڈاکٹر بدرالدین بٹ	۸۶
۸	خبرنامہ		۹۴

English Section

۹	EDUCATIONAL IMPLICATIONS OF KHUDI	Tariq Masoodi	

☆☆☆

اداریہ

اقبال ریویو کا تازہ شمارہ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہے جس کیلئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ اقبال ریویو کا سفر تین دہائیوں سے جاری ہے۔ یہ کشفِ سفر ہمارے لئے ایک سعادت سے کم نہیں۔ ہمیں صدر اقبال اکیڈمی جناب ظہیر الدین صاحب جیسے حکیم الطبع درویش صفت سرپرست کی رفاقت کا شرف حاصل ہے۔ ظہیر صاحب ایک جانے پہچانے اقبال اسکالر ہیں۔ ہمیں ان کی مصاحبت میں اقبال کی مختلف فکری جہتوں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ زیرِ نظر شمارہ میں موصوف کی ہی ایماء پر ''نالہ یتیم'' اور ''فریادامت'' کو شریک اشاعت کیا گیا۔ یہ نظمیں عرصہ دراز سے شیدائیان اقبال کی نگاہوں سے مستور تھیں۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اقبال نے جو نظمیں پڑھی تھیں ان میں جابجا غالب کا انداز تخیل اور اسلوبِ بیان پایا جاتا ہے۔ الفاظ، بندشیں اور ترکیبیں غالب سے بہت کچھ مماثل معلوم ہوتی ہیں۔ ''نالہ یتیم'' اور ''فریادامت'' کے مطالعہ سے یہ تاثر نمایاں ہوجاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی حیات عشق وشوق وآرزو سے عبارت ہے۔ لیکن بہت جلد وہ اسفل سے اعلیٰ کی طرح صعود کرجاتے ہیں۔

اقبالؔ کے ''ساقی نامہ'' اور جمیلؔ کے ''آب وسراب'' کے تناظر میں ڈاکٹر منظر اعجاز کا مشمولہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اور بڑی حد تک موضوع کا حق ادا کیا ہے۔

اقبال کے نزدیک اسلام ایک ابدی حقیقت ہے اقبال دین حق حرم اور کتاب ہدایت کی حفاظت اور اس کی تعلیمات پر کاربند رہنے کے متمنی رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ دریائے نیل سے لے کر کاشغر کی دور دراز سرحدوں تک مسلمان ایک ہی ملت بن جائیں اور ساری دنیا میں اسلام کی عظمت رفتہ بحال ہو۔ اس لئے انہوں نے ''معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز'' کا نعرہ بلند کیا۔ اسی

اجمال کی تفصیل ''اقبال اور وحدت اسلامی'' کے زیرعنوان مقالہ میں جناب رانا غلام شبیر صاحب نے جائزہ لیا ہے۔اس شمارہ میں ایک نہایت اہم مذاکرے کی تلخیص بعنوان اقبال اور فکر اسلامی کی تشکیل نو شامل کی گئی ہے۔اقبال نے اپنے عصر میں شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کو مضبوط و مستحکم کیا۔اُن کے دلوں سے احساس کمتری کو دور کیا۔عوام وخواص سب ہی ان کے کلام کے گرویدہ ہوئے۔لیکن اُن کی نثر، خصوصاً خطبات کی جانب اہل علم ونظر کی وہ توجہ منعطف نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق تھی اسی پس منظر میں اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل نو پر منعقدہ مذاکرہ علمی کی روداد کو شمارہ ہذا میں شامل کیا گیا ہے۔شاید یہ روداد اقبال شناسی کی تحریک کو جاری رکھنے کیلئے مہمیز کا کام دے گی یہ ضروری نہیں کہ اقبال کے خیالات سب کے لئے قابل قبول ہوں لیکن قابل غور ضرور ہیں۔

محترم قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اس شمارہ میں شامل مختلف فکر انگیز موضوعات پر اظہار خیال کریں۔خصوصاً ہمارے رہروانِ تحقیق سے توقع ہے کہ اپنے افکار تازہ کے رنگا رنگ پھول کھلانے میں ہماری مدد کریں۔ویسے اقبال ریویو کو بہتر اور معیاری بنانے کیلئے آپ کے ہر قسم کا تعاون درکار ہے۔

محمد ضیاء الدین نیّر

☆☆☆

نالہ یتیم

یہ درد انگریز نظم علامہ مرحوم نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسہ (۲۴ر فروری ۱۹۰۰ء کو بعد نماز عصر) پڑھی تھی شمس العلماء مولانا نذیر احمد اس اجلاس کے صدر تھے جنہوں نے فرمایا میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دلخراش نظم کبھی نہیں سنی۔

آہ! کیا کہیئے کہ اب پہلو میں اپنا دل نہیں
بجھ گئی جب شمعِ روشن درخورِ محفل نہیں

اے مضافِ نظم ہستی میں ترے قابل نہیں
نا امیدی جس کو طئے کرلے یہ وہ منزل نہیں

ہائے کس منہ سے شریکِ بزمِ میخانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہوجائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرت غیرتِ نوک سناں ہونے لگا
یوسف غم زینتِ بازار جاں ہونے لگا

دل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا
نالۂ دل رُوشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ سرائے رشکِ صد فریاد ہو
جو سرودِ عندلیبِ گلشن برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاکِ گریباں کیلئے
اشکِ غم ڈھلنے لگے پابوس داماں کیلئے

مضطرب ہے یوں دلِ نالاں بیاباں کیلئے
جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کیلئے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر
روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرتِ دلِ خو کردۂ حسرت نہیں
در خورِ بزمِ طرب شمعِ سرِ تُربت نہیں

زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں
غیرِ حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے
ہستیِ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیامِ بحرِ ہستی جزر و مدّ اسلام کا
گاہے گاہے آنکلتی ہے مسرت کی ہوا

زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا
لے کے طوفانِ ستم ابرِ تغیر آگیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل کوئی ناکام ہے
اس نظارہ کا مگر خاکِ لحد انجام ہے

اے فلک تجھ سے تمنائے سعادت پروری
ہر ستارا ہے ترا داغِ دلِ نیک اختری

تو نے رکھا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری؟
اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری

دوستی از کس نمے بینیم یاراں راچہ شُد
دوستی کو آخر آمد دو ستداراں راچہ شُد

نُطق کرسکتا نہیں کیفیتِ غم کو عیاں
اس کی تیزی کو مٹادیتے ہیں اندازِ بیاں

آنہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں
خندہ زن میرے لب گویا پہ ہے دردِ نہاں

عجز گویائی ہے گویا حکمِ قیدِ خامشی
مجرمِ اظہار غم کو یہ سزا ملنے لگی

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے
اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے

ظلِ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ دیدۂ پُرنم مجھے

مضطرب اے دل نہ ہونا ذوقِ طفلی کیلئے
تو بنا ہے تلخیٔ اشکِ یتیمی کیلئے

سایۂ رحمت ہے تُو اے ظلِّ دامانِ پدر
غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گذر

رہنما ہے وادیٔ عالم میں تو مثلِ خضر
تُو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سر بسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہُما تاثر ہے
تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عین طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی
صبح پیری کی مگر بن کر یتیمی آگئی

یاد ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی
شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوشش صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری
اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری

کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطان تری
اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظم عالم میں نہیں موجود ساز بے کسی
ہوگئی پھر کیوں یتیمی صید باز بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصور خندہ گُل کا سماں
اور کچھ مشکل نہیں اے برق تیری شوخیاں

صبح کا اختر نہیں کلکِ تصور پر گراں
اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسم کے نشاں

یہ تبسم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے
دردِ پنہاں کو چُھپانے کیلئے اک پردہ ہے

یاد ایامِ سلف تو نے مجھے تڑپا دیا
آہ اے چشم تصور تو نے کیا دکھلا دیا

اے فراقِ رفتگاں یہ تو نے کیا دِکھلادیا
دردِ پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکادیا

رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمدِ بُوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم
ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صُبح دم
یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کا زیرو بم

رنگ کچھ شہر خموشاں میں جماسکتی نہیں
خفتگانِ کنج مرقد کو جگا سکتی نہیں

ہر گھڑی اے دل نہ یُوں اشکوں کا دریا چاہیئے
داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہیئے

ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہیئے
آستاں اس کو یتیمِ ہاشمی کا چاہیئے

چشم باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے
سامنے اک دم میں درگاہ شہؑ ابرار ہے

اے مدد گارِ غریباں اے پناہ بے کساں
اے نصیرِ عاجزاں اے مایۂ بے مائگاں

کارواں صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں
کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلِ مشکل کیلئے
نام ہے تیرا شفا دُکھتے ہوئے دل کیلئے

بیکسوں میں تاب جورِ آسماں ہوتی نہیں
ان دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں

کون وہ آفت ہے جو رہنِ بیاں ہوتی نہیں
اک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں

میری صورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی
ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی

بزم عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تُو
بہر انساں جبرئیل آیۂ رحمت ہے تُو

اے دیار علم و حکمت قبلۂ امت ہے تُو
اے ضیائے چشمِ ایماں زیب ہر مدحت ہے تُو

دروجو انساں کا تھا وہ تیرے پہلو سے اٹھا
قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اٹھا

آب کو ژرتشنہ کا مانِ محبت کا ہے تو
جس کے ہر قطرے میں سوموتی ہوں وہ دریا ہے تو

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو
معنی یسین ہے تو مفہوم اوادنیٰ ہے تو

اس نے پہچانا نہ تیری ذات پُر انوار کو
جو نہ سمجھا احمد بے میم کے اسرار کو

دِلربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو
مثلِ آوازِ پدر شیریں تراز کوثر ہے تو

جس سے تاج عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو
از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیب حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا
تھی موخر گرچہ آمد پر مقدم تو ہوا

تیرا رتبہ جوہرِ آئینہ لولاک ہے
فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقین نمناک ہے

تیرے سایہ سے منور دیدہ افلاک ہے
کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے
تو ظہور لن ترانی گوئے اوجِ طُور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ در و دہقان پر
ہے پسینے سے نمایاں مہرِ تاباں کا اثر

جھلکیاں امید کی آتی ہیں چہرے پر نظر
کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

یا محمدؐ کہہ کے اٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکین اسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دین حق وہ دامن غار حرا
جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا

وہ حصار عافیت وہ سلسلہ فاران کا
جس کے ہر ذرہ سے اٹھی دین کامل کی صدا

فخر پابوسی سے تیری آسماں سا ہوگئی
یہ زمیں ہم پایۂ عرشِ معلّٰی ہوگئی

نظم قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا

آ گرا ہُوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیئے بدلہ مری اُفتاد کا

آ نہ سکتا تھا زباں تک بے کسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم ذرا بے تابیِ دل کیا صدا آتی ہے یہ
لطفِ آبِ چشمہ حیواں کو شرماتی ہے یہ

دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ

ہاں ادب اے دل بڑھا اعزاز مُشتِ خاک کا
میں مخاطب ہوں جناب سید لولاکؐ کا

اے گرفتار یتیمی اے اسیر قید غم!
تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیدِ خیرالامم

نا امیدی نے کئے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم
چیرتا ہے دل کو تیرا نالہ درد و الم

تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کیلئے بجلی ترا افسانہ ہے
دل نہیں پہلو میں تیرے غم کا عشرت خانہ ہے

جس پہ بربادی ہو صدقے وہ ترا ویرانہ ہے
سہم جائے جس سے فرحت وہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرش معظم بھی تری فریاد سے

خون رلواتا ہے تیرا دِیدۂ گریاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے

کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تُو مثلِ تنِ بے جاں مجھے

میری امت کیا شریکِ درد پیغمبرؐ نہیں
کیا جہاں میں عاشقان شافع محشرؐ نہیں

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں
میری امت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں

امتحانِ صدق و ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں
ان مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل و جاں سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

جا کے یوں کہنا کہ اے گلہائے باغ مصطفیٰؐ
تم سے برگشتہ نہ ہوجائے زمانہ کی ہوا

عرصہ ہستی میں از بہرِ حصولِ مدعا
رشکِ صدا اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا

یہ وہ جادو ہے جس سے دیو حرماں دور ہو
یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے دورِ عصیاں دور ہو

یہ دعا میدانِ محشر میں بڑی کام آئے گی
شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی

آتشِ عشقِ الٰہی سے تمہیں گرمائے گی
جو نہ موسیٰؑ نے بھی دیکھا تھا تمہیں دکھلائے گی

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالی کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگِ ہمت کو لانا چاہئے
احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہئے

بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہئے
مِل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہئے

کام بے دولت تہِ چرخِ کہن چلتا نہیں
نخلِ مقصد غیر آبِ زر کہیں پھلتا نہیں

صیدِ شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اور ہے
نوک جس کی دل میں چبھتی ہو وہ کانٹا اور ہے

علت حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے
دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ
نسخۂ مہرو محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی

کہہ رہی ہے اہل دل سے ابتداء اسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہاتھ ہے

☆☆☆

فریادِ اُمّت

یہ نظم اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو ظہر وعصر کے درمیان خان بہادر غلام احمد خان مشیر مال ریاست جموں وکشمیر کی صدارت میں (تخیلا بآستانہ سرور کائنات خلاصہ موجودات) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں (ابر گہربار کے عنوان سے) پڑھی تھی۔ ازاں بعد ۱۹۱۳ء میں (باجازت مصنف) فریادامت کے نام سے چھاپ دی گئی۔

دِل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیوں کر

شوقِ نظارا یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیوں کر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

صدمہ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیوں کر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری
اشک غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیوں کر

تجھ میں سو نغمے ہیں اے تار ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیو کر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیوں کر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خُم دل سے اچھل جائے گی

آسماں مجھ کو بجھادے جو فروزاں ہوں میں
صورت شمع سر گور غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکر مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تو میری صورت پہ نا جانا گلچیں
دیکھنے کی صفت تو گل خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیِ فانی کو
نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنج عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جاکے سنا اور کسی کو ناصح
اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبالؔ ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعہ سوختہ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

قصہ دار و رسن بازی طفلانہ دل
التجائے ارنی سرخی افسانہ دل

یا رب اس ساغر لبریز کی مئے کیا ہوگی
جادہ ملک بقا ہے خط پیمانہ دل

ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب
جل گئی مرزعہ ہستی تو اگا دانہ دل

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانہ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانہ دل

کچھ اسی کو ہے مزا دھر میں آزادی کا
جو ہوا قیدی زنجیر پری خانہ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو
رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانہ دل

ہائے کیا جانئے اس گھر کا مکیں کیسا ہو
ہوں جو منصور سے دربان در خانہ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنادیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانہ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں ''برا ہوتا ہے''
عقل آتی مجھے پابند سلاسل ہو کر

آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم
اس سے پوچھے کوئی کیا دل نے لیا دل ہو کر

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اٹھ گیا بزم سے میں پردہ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہوجانا
حق دکھایا مجھے اس نقطہ نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل
دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

طور پر تو نے جو اے دیدہ موسی دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پس محمل ہو کر

کیا کہوں بے خودی شوق میں لذت کیا ہے
تو نے دیکھا نہیں زاہد کبھی غافل ہو کر

راہ الفت میں رواں ہوں کبھی افتادہ ہوں
موج ہو کر کبھی خاک لب ساحل ہو کر

دم خنجر میں دم ذبح سما جاتا ہوں
جوھر آئنہ خنجر قاتل ہو کر

وہ مسافر ہوں ملے جب نہ پتا منزل کا
خود بھی مٹ جاؤں نشان رہ منزل ہو کر

ہے فروغ دو جہاں داغ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

دیدہ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی
آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الہیٰ توبہ
دل تڑپتا ہے مرا طائر بسمل ہو کر

مئے عرفاں سے مرے کاسہ دل بھر جائے
میں بھی نکلاء ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ سامان ہے اک بے سروساماں ہونا
مجھ کو جمعیت خاطر ہے پریشاں ہونا

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

دل جو برباد محبت ہوا آباد ہوا
ساز تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینہ کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویس قرنیؓ سے چھپنا
کبھی برق نگہ موسی عمراں ہونا

قاب قوسین بھی دعوی بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری الفت میں
ہمہ تن شوق ہوائے عربستان ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظارہ رخسار سے حیراں ہونا

حندہ صبح تمنائے ابراہیم استی
چہرہ پر دار بحیرت کدۂ میم استی

حشر میں ابر شفاعت کا گہر بار آیا
دیکھ اے جنس عمل تیرا خریدار آیا

پیرہن عشق کا جب حسن ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا دیکھنا وہ کافر دیندار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوش سودائے محبت میں گریباں اپنا
میں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشن جنت کو کیا اس پہ نثار
دشت یثرب میں اگر زیر قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرق شرم میں ڈوبا جو گنہگار آیا

وہ مری شرم گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مئے خانہ عجب مئے خانہ
یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

ماعر فنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحر محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتی نوح ہے ہر موجہ قلزم مجھ کو

حسن تیرا میری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاع مہ و انجم مجھ کو

تیرے قربان میں اے ساقی مئے خانہ عشق
میں نے اک جام کہا تو نے دیئے خم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری الفت میں
کہ فرشتوں نے لیا بہر تیمّم مجھ کو

گرد آسا سردامن سے لگا پھرتا ہوں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
حور سے کہنا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

صفتِ نوکِ سرِخار شب فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہ یثرب میں
طور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکین کردی
شور محشر ہوا گل بانگِ ترنم مجھ کو

اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تاب تکلم مجھ کو

ہے ابھی امت مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودیٔ شوق نہ کر گم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نوحؑ کا طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمت عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پاکے اشارا تیرا

گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنی لولاک سے پایا تیرا

ناز تھا حضرت موسیٰ کو ید بیضا پر
سو تجلی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا

چشم ہستی صفتِ دیدہ اعمی ہوتی
دیدہ کن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

مجھ کو انکار نہیں آمد مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں امت مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال امت کا برا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفت آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبُّر کہ الہیٰ توبہ
اپنی ہر بات کو آواز خدا کہتے ہیں

ان کا ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو برا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اسے چاہئے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا ہو تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے باد صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنہ محشر برپا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ ربا کہتے ہیں

جن کی دینداری میں ہے آرزوئے زر پنہاں
آکے دھوکے میں انہیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اس نے
یہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں

مقصد لحمک لحمی پہ کھلی ان کی زباں
یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی برا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہوائے شافع حشر
میرے جیسوں کو تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

بغض للہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دین ہو کہ اپنوں سے کریں ترک سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے ''صلحا'' کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکر کفن بھی نہ جسے
یہ اسے بندہ بے دام ہوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلے مقصود سے کیونکر اپنا
اختر سوختہ قیس ہے اختر اپنا

امراء جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھ کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرف تمنا کہنا

درد مندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے ؟
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شکوہ منت کش لب ہے کبھی منت کش چشم
میرا کہنا جو ہے رونا تو ہے رونا کہنا

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا

بادہ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرمان نہ تیرا نہ خدا کا کہنا

ہم نے سو بار کہا 'قوم کی حالت ہے بری'
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو توبرہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہ دو عالم ہو کر

اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لب فریاد ہوا وا اپنا

ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعوی اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب
ہائے ان مالیوں نے باغ اجاڑا اپنا

ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا

دیکھ اسے نوحؑ کی کشتی کے بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینا اپنا

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا

ہاں برس ابر کرم دیر نہیں ہے اچھی
کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا

اب جو ہے ابر مصیبت کا دھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دل شیدا اپنا

یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا

زندگی تجھ سے ہے اے فخر براہیمؑ اپنی
کہ دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے انہیں لوگوں کی ہمت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے ہو عزت دین و دنیا
ہائے اے شافع محشرؐ و دعا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری
ہاں بتادے ہمیں وہ طرز وفا کونسی ہے

جس کے ہر قطرہ میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتادے وہ مئے ہوش ربا کون سی ہے

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے وہ آواز درا کون سی ہے

اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی
جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

اپنی کھیتی ہے اجڑ جانے کو اے ابر کرم
تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے

ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی
آج دنیا میں وہ بزم فقرا کون سی ہے

تیرے قرباں کہ دکھادی ہے یہ محفل تو نے
میں نے پوچھا جو اخوت کی بنا کون سی ہے

راہ اس محفل رنگیں کی دکھادے سب کو
اور اس بزم کا دیوانہ بنادے سب کو

☆☆☆

ڈاکٹر منظر اعجاز

اقبالؔ و جمیلؔ

(''ساقی نامہ'' اور ''آب و سراب'' کے تناظر میں)

جدید اردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں دو ہی ایسی مثنویات رقم ہو سکیں جنھیں ذہن جدید کے افکار عظیم اور فن شاعری کے شہکار جمیل سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔ اول اقبالؔ کی مثنوی ''ساقی نامہ'' اور آخر جمیلؔ مظہری کی ''آب و سراب۔'' ان دونوں کی تخلیق میں زمانی فصل تقریباً وہی ہے جو دونوں کی تاریخ پیدائش میں ہے یعنی تین دہائی کا فرق، لیکن دونوں کے ذہنی، فکری پس منظر میں کوئی فرق نہیں۔ ادیان و ملل، سیاسیات و معاشیات اور طبعیات و مابعد الطبعیات کے عالمی منظر نامے پر دونوں کی نگاہ گہری ہے۔ روح عصر کی بے چینیوں کا شدید احساس دونوں کو ہے۔ ایک ایسی تشنگی ہے جس نے انسانیت کے ہوش اڑا دئے ہیں۔ ایک ایسی پیاس ہے جس سے انسانیت حواس باختہ ہے۔ انسانیت کا قافلہ جستجوئے آب میں بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹک رہا ہے۔ اقبالؔ ایسے میں تسکین قلب و روح کا سامان بہم پہنچانے کی فنکارانہ کاوش کرتے ہیں۔ وہ فصل گل اور باد بہاری کے ساتھ ساتھ صہبا گساری کا اہتمام بھی بطور خاص کرتے ہیں، لیکن مدہوش ہونے اور ہوش کھونے کے لئے نہیں بلکہ ہوش میں لانے کے لئے۔ وہ بیماری دل کی تشخیص کے لئے دکھتی رگوں پر انگلیاں بھی رکھتے ہیں اور امراض کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ سیاست گری، سرمایہ داری، مسلمان کی زنار پوشی یہاں تک کہ تصوف، تکلم، شریعت، کلام سارے کے سارے زد میں آجاتے ہیں اور تاسف کا اظہار اس انداز میں ہوتا ہے کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

ظاہر ہے کہ ''خلیفۃ اللہ فی الارض'' ہونے کی وجہ سے عالم انسان ہی نہیں کائنات فطرت کی سلامتی کا ذمہ دار مسلمان ہی ہے۔ شاعر ہر چند کہ پیر بھی ہے اور فقیر بھی ہے، لیکن اس فقیری میں

بھی جس جنس گراں مایہ کی وجہ سے وہ امیر ہے، وہ من حیثیت الکل عشق کی آگ ہی ہے جسے وہ اپنے قافلے میں لٹا کر آسودگی حاصل کرنا چاہتا ہے ۔

مرے قافلے میں لٹادے اسے
لٹادے ٹھکانے لگادے اسے

تا کہ اس قافلے کی خودی پیدا ہو جائے۔ کیونکہ بقول اقبالؔ:

''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا؟ کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں مقام کیا ہے؟ بہ اعتبار اس مقام کے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ یہ سوالات ہیں جو مذہب، فلسفہ اور اعلیٰ شاعری میں مشترک ہیں۔''

اقبالؔ مذہب پسند بھی ہیں، فلسفی بھی اور اعلیٰ معیار کے شاعر بھی۔ چنانچہ ان سے متعلق مشترک سوالات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ سوال بھی قائم کرتے ہیں کہ مادہ کیا ہے اور پھر اس کا جواب بھی مرتب کرتے ہیں جو بالآخر نتیجہ خیز اور مقصد انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ خود انہیں کے لفظوں میں:

"what then is matter? A colony of egoes of a low order out of which emerges the ego of a higher order,when their association and interaction reach a certain degree of co-ordination."

ظاہر ہے کہ اقبالؔ خودی کو روایتی مفہوم میں استعمال نہیں کرتے ۔ وہ اسے ایک خاص فلسفیانہ مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خودی وہ اصول ہے جو کثرت کا واحد سبب ہے۔ اقبالؔ خودی کی دو سطحیں مانتے ہیں جسے وہ ''امر'' اور ''خلق'' کہتے ہیں، امر کی سطح پر خودی غیر معین، لامحدود، لازمانی اور لامکانی وحدت ارادہ ہوتی ہے، لیکن جب امر کی سطح سے نیچے خلق کی سطح پر آتی ہے تو اس کی غیر اور لامحدود توانائی پر روک لگ جاتی ہے اور وہ زمانی و مکانی معنیات کی اسیر ہو جاتی ہے اور کثرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خلق کی سطح پر خودی اضافی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اشخاص و افراد اور مظاہر و موجودات اسی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ سب انائے محض یا

امری خودی سے اپنا ظہور حاصل کرتے ہیں۔ حیات اسی کی ایک جہت ہے ۔

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شئے سے پیدا دم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہردم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے
اسی کے بیاباں، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے، اسی کے پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبرئیل و حور
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

ظاہر ہے کہ ''ساقی نامہ'' کا اصل موضوع خودی ہے اور اس کا نقطہ عروج عرفان خودی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

جمیل مظہری کی مثنوی ''آب وسراب'' بھی نتائج کے اعتبار سے مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی خودی اور خودشناسی کی ہی تجلیاں حریم قلب ونظر میں جلوہ ریز دکھائی دیتی ہیں، یہ الگ بات

ہے کے ''ساقی نامہ'' کا آغاز فصل گل، باد بہاری اور صہبا گساری کے اہتمام سے ہوا ہے جب کہ جمیل مظہری نے ابتدا ہی میں تشنگی کو ''آب آفریں'' کے چھینٹے سے شعلے کی مانند بھڑکا دیا ہے۔ جیسا کہ افتتاحیہ قطعہ ''اعتراف'' کے تاثرات سے واضح ہے ۔

تو پوجتی آئی ہے ازل سے
تدبیر سراب آفریں کو
اے تشنہ دلی حواس میں آ
اک سجدہ کر آب آفریں کو

شعلے کی مانند بھڑکی ہوئی اس پیاس نے طلب آب کو بڑھا دیا ہے۔ یہی پیاس، یہی تشنگی اس مثنوی کی کلیدی علامت ہے۔ عصری ذہنی نا آسودگی کی کیفیات اس علامتی تعبیر میں مضمر ہیں۔ شاعر نے پیاس، نا آسودگی اور کرب و اضطراب سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات کو سہارا دینے کے لئے آسودگی کا ایک امکان دیا ہے۔ آب اور آب آفریں کا ایک تصور دیا ہے۔ اس کے بعد کاروان حیات کے حال زار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے ۔

اللہ یہ ہولناک صحرا
کیا دے گا سوائے خاک صحرا
بے آب و گیاہ ہے یہ صحرا
بے چشمہ و چاہ ہے یہ صحرا
لو چلتی ہے کارواں ہیں پیاسے
بچے پیاسے جواں ہیں پیاسے

یہاں مایوسی اور محرومی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یاسیت اور قنوطیت کے مہیب غار سے انسانیت کی بلبلاتی ہوئی آواز ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تنہائی اور ناپرسانی کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر وجودیت (Existentialism) کے فلسفے سے متاثر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان اس کائنات فطرت میں بالکل اجنبی ہے، آؤٹ سائڈر ہے۔ تنہائی اور ناپرسانی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ یہ اس انسان کا المیہ ہے جو وجہ تخلیق کائنات بھی ہے اور '' خلیفۃ اللہ فی الارض '' بھی۔ اس پر کائنات کے اسرار و رموز کیسے کھل سکتے ہیں، جس پر خود

اپنی زندگی کا راز نہیں کھلتا۔ وہ اس کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ اس کا دل بیتاب اور وقف اضطراب ہے۔ قدرت کے اس ستم کو اقبالؔ نے بھی محسوس کیا تھا جب ہی وہ ''انسان'' جیسی نظم لکھنے پر مجبور ہوئے تھے ۔

قدرت کا یہ عجیب ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

دوسری طرف جب عالم فطرت پر نظر جاتی ہے تو مظاہر و موجودات کی کیفیت مختلف دکھائی دیتی ہے۔ موج دریا گرم خرام ہے اور دریا بحر کی جانب جادہ پیما ہے۔ ہوا، بادل کو کاندھے پر اٹھائے اڑائے پھر رہی ہے۔ زندان فلک میں پابہ زنجیر تارے شراب تقدیر میں مست ہیں۔ بیداری کا پیغام لانے والا عابد سحر خیز، خورشید جہاں تاب، مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کے شفق کا ساغر انڈیل رہا ہے۔ گویا کہ ہر شئے کا وجود لذت گیر ہے۔ ہر شئے نمود کے نشے میں چور ہے، لیکن ۔

کوئی نہیں ہے غم گسار انساں
کیا تلخ ہے روزگار انساں

انسانی زندگی کے مشاہدے اور مطالعے نے اقبالؔ کی نظم میں جو تلخی کی کیفیت پیدا کی ہے، یہی تلخی جمیلؔ مظہری کی '' آب و سراب'' میں تشنگی کی علامت کے طور پر ابھری ہے۔ اسی تشنگی نے انھیں '' آب و سراب'' کا فسانہ چھیڑنے پر مجبور کیا ہے ۔

اے مطرب بزم آشنائی
ماتم خانہ ہے یہ خدائی
ماتم ہے کرانہ تا کرانہ
چھیڑ آب و سراب کا فسانہ

پیاسوں کا ہجوم فوج در فوج
دریائے سراب موج در موج

ہر جذبۂ نا صبور پیاسا
دانش پیاسی ، شعور پیاسا
پیاسا ہے جنوں بھی ، خرد بھی
پیاسا ہے غرور بھی ، حسد بھی

جلوے پیاسے نگاہ پیاسی
حیرت بالائے چاہ پیاسی
کچھ شوق کنار جو بھی پیاسے
کچھ لب بہ لب سبو بھی پیاسے
ہر موج حیات کی زبانی
اک تشنہ لبی کی سو کہانی
تاریخ ہماری اور کیا ہے
اس تشنہ لبی کا مرثیہ ہے

یہ عصر حاضر کے ذہنی فکری ماحول کی عکاسی ہے۔اس میں ''شوق کنار جو''اور''لب برلب سبو''باترتیب عصری حکمت اورعصری الٰہیات کی علامتی تعبیریں ہیں۔روح عصر پیاسی ہے۔ ہردل میں ایک بے بجھائی سی آگ لگی ہوئی ہے،لیکن کسی فردواحد کا یہ ذاتی اور انفرادی معاملہ نہیں ہے، یہ ایک اجتماعی اورآفاقی مسئلہ ہے۔یہ وہ مسئلہ ہے جس کوحل کرنے کا دعویٰ ہر فلسفہ اور ہر منطق ، ہر دین اور ہر حکمت کو تھا، لیکن انہوں نے جو حل پیش کیا،وہ بذات خود ایک مسئلہ تھا۔یہی مسئلہ پیش نظر تھا جب Modern History of western Philosophy کے مصنف، برٹرانڈرسل نے کہا تھا کہ فلسفے مسائل کا حل نہیں دیتے،ان کی آگاہی دیتے ہیں۔یہی بات جمیل مظہری نے بھی محسوس کی، جب انھوں نے کہا ۔

وہ عقل کے بندگان زنجیر
تکتے تھے ادھر بچشم تحقیر
یہ مدعیان عقل و دانش
یہ سادہ دلان عقل و دانش
اپنی تمیز نیک و بد پر
دانش پر شعور پر ، خرد پر
مغرور نہ ہوں بقول عرفیؔ

یہاں جمیلؔ مظہری اس طبقے کے خلاف بھی اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جسے نہ تو مسئلے کا احساس تھا، نہ مسئلے کے حل کی تلاش۔ وہ

نا محرم جلوۂ معانی
سمجھا کئے ریت ہی کو پانی

جمیلؔ مظہری علمائے فلسفہ اور حکمائے طبعیات کے بعد شاعر، صوفی اور تارک الدنیا کی بھی خبر لیتے ہیں، جنھوں نے ترک کا شیوہ اختیار کیا تو منزل کو بھی ترک کر دیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جمیلؔ مظہری کا انداز و اسلوب اور لہجہ متاسفانہ ہو جاتا ہے۔

لیکن جو تھے رازدان و عارف
جویائے حقائق و معارف
جن کی ساری حیات موہوم
اک لطف سراب سے بھی محروم

پانی کو بھی وہ سراب سمجھے
جلوہ تھا مگر نقاب سمجھے

یعنی ان کا بھی وہی حشر ہوا جو مفکرین و حکما کا ہوا تھا۔ وہ بھی آسودگی اور مسئلے کے حل سے اتنی ہی دور رہے۔ چنانچہ

دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے
انجام غرض کہ تشنگی ہے

تشنگی کے اس احساس کا لازمی نتیجہ یاسیت اور فراریت ہے اور یہی اس عہد کا ذہنی سرمایہ ہے جس نے مسائل کے حل کے امکانات کو مشکوک و مشتبہ کر کے چھوڑ دیا ہے، جس کے نتیجے میں زندگی اپنی معنویت اور مقصدیت کھو چکی ہے۔ بہتری کی توقعات سے ناامید ہو کر بیزاری کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ جمیل مظہری اس صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں۔

اے قلب و نظر کے تشنہ کامو
اے ریگ و سراب کے غلامو

احساس تمہاری تشنگی کا
رخ پھیر چکا ہے زندگی کا

جمیل مظہری کے خیال میں اس صورت حال کے دو اسباب ہیں، جنھیں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

ہم کیا کہیں ہم تو بے ادب ہیں
اس تشنہ لبی کے دو سبب ہیں
پہلی ہے یہ وجہ سر گرانی
یعنی کے ملا جو تم کو پانی
پانی نہیں عکس آب تھا وہ
جو کچھ بھی ملا سراب تھا وہ
اور دوسری وجہ جو ہے پیارے
وہ دل کی تہوں میں ہے تمہارے
جو روح پہ ہے ازل سے طاری
یہ تشنہ لبی نہیں تمہاری
یہ پیاس نہیں ہے تمہاری بابا
تم میں جو خدا ہے وہ ہے پیاسا

جو قدرتیں اس نے تم کو دی ہیں
وہ سینہ شوق میں گھٹی ہیں
حالت طاری ہے ان پہ غش کی
ہونٹوں پہ صدا ہے العطش کی
خطرے میں ہے ان کی زندگانی
للہ پلاؤ ان کو پانی

حالانکہ ان کی سبیل کے لئے مذاہب مقرر تھے، وہ متحجر ہو چکے ہیں۔ جمیل مظہری نے انھیں جہل کدوں سے عبارت کیا ہے۔ انھوں نے دانش کے فتور اور مذہب کے قصور پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک جمیل مظہری کی مثنوی میں عصری ذہن کی عکاسی ملتی ہے، کوئی نظریہ یا فلسفہ نہیں ملتا۔ البتہ مثنوی کے ساتویں بند سے ایک تکوینی تصور (Cosmological concept) کی شروعات ہوتی ہے۔ جمیل مظہری انسان کی قدرت نہانی کی کہانی سے اس قصے کا آغاز کرتے ہیں، اس کے بعد انسان کے ساختمانی عناصر کی ہمکاری اور ان کی ترکیب و ترتیب سے پیکر انسانی کی تعمیر کے مراحل پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

پانی میں بھگو کے آگ کی روح
مٹی میں سمو کے آگ کی روح

اک پیکر معتدل بنایا
تم چونک اٹھے جو دل بنایا

پھر اس تخلیق عظیم کا مقصد بھی بیان کرتے ہیں ۔

مقصد یہ تھا بہ فضل باری
آجائے تمہیں خود اختیاری

اس کے لئے تربیت کا انتظام بھی کیا گیا ۔

ہوتی رہی تربیت تمہاری
منظور تھی منزلت تمہاری

سکھا کے تمیز خیر و شر کی
شاخوں کو دکھا کے اک شجر کی
فرمان ہوا کہ تم ہو دانا
دیکھو آدم ادھر نہ جانا

یہ جبر و اختیار کا بھید، محکومی و اقتدار کا راز، خودی اور بے خودی کا یہ موڑ، آگہی کا سخت مقام ٹھہرا۔ یہ کشاکش اور کش مکش کا مرحلہ تھا۔ فرمان خداوندی یا حکم امتناعی دل پر بارگراں تھا جس سے خودی عالم اضطراب و اضطرار میں مبتلا ہوئی۔ چنانچہ ؎

بے ساختہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا
تخلیق کا حوصلہ نکالا
پہلا جو کیا گناہ تم نے
کھینچی اک سرد آہ تم نے

لیکن یہ آہ سرد کیا تھی؟ جمیل مظہری کی نظم ''فسانہ آدم'' کے مطابق یہ ضمیر مشت کا عزم جلیل تھا اور بقول اقبال اس سے زندگی کا ضمیر بے پردہ ہوگیا، اس افسانے کا تجزیہ مفسرین قرآنی اور متکلمین اسلام نے بھی بڑے شد و مد سے کیا ہے۔ مسیحی علما اور فلسفیوں کی موشگافیوں سے یہ مسئلہ جبر و قدر کی کشاکش اور کشمکش کا مسئلہ بن گیا۔ اس سلسلے کی بحث میں جبر و قدر کے درمیان ایک معتدل صورت ''کسب'' کے عنوان سے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی یعنی انسانی جدو جہد اور کوشش پر اسے منحصر قرار دیا گیا، لیکن شوپنہار نے اس کوشش اور جدو جہد کو بھی توفیق الٰہی قرار دے کر انسان کو مجبور اور تقدیر کا بندہ قرار دیا۔ اقبال نے ہبوط آدم کے سلسلے میں قرآن کی عبادتوں کے حوالے سے تشکیل جدید میں شدید بحث کی ہے۔ ان کی نظمیں ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' یا ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' یا اور بھی کئی نظمیں اور اشعار ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آدم کو سزا یافتہ مجرم کی طرح جنت سے نہیں نکالا گیا، ورنہ خلیفة الله فی الارض کے لئے یہ کائنات دارالعذاب مقرر ہوتی، جہاں تک ''آب و سراب'' کا تعلق ہے، فکر جمیل اقبال کے زاویہ نظر سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں ؎

یہ بات نہ تھی خدا کو منظور
مختار کا جانشیں ہو مجبور

کیونکہ جس کارخانہ قدرت یعنی کائنات آب وگل پر آدم کو حاکم مقرر کیا جانا تھا اس کے لئے صاحب اقتدار و اختیار ہونا لازم تھا اس لئے خدا نے درس کا خصوصی انتظام کیا۔ جنت کو مدرسہ بنایا اور خود آدم کو سبق پڑھاتا رہا۔ جب پڑھائی پوری ہوئی تو امتحان بھی لیا۔ آدم اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور دستار فضیلت سے سرفراز فرمائے گئے۔ اس کے بعد ؎

با جاہ و جلال شہریاری
شہزادہ خلد کی سواری
اس محشر آب و گل میں پہنچی
آہٹ سی زمیں کے دل میں پہنچی

بقول اقبالؔ ''روح ارضی'' نے آدم کا استقبال کیا اور جمیلؔ مظہری کے مطابق روح دہر تعظیم کو اٹھی، لیکن کچھ سرکشان محکوم نے جو یہ منظر دیکھا تو گھبرائے کہ ہم کہیں معدوم نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آدم کے خلاف سازش رچی گئی۔ ان سبھوں نے مل کر بغاوت کر دی، یہاں تک کہ انسان میں جو آدم یعنی مادی ،جبلی محرکات تھے وہ بھی ان باغی اور سرکش عناصر کے ہمنوا بن گئے۔ اس سے سازشی اور سرکش عناصر کی باغیانہ تحریک کو تقویت ملی۔ جنگ چھڑ گئی۔ کارزار حیات میں تصادم و پیکار اور معرکۂ وجود کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن انسان نے اس رزم گاہ حیات میں بالآخر حوصلہ ہار دیا۔ اس نے گھبرا کے صلح کر لی اور مجبوری کی لعنت میں گرفتار ہوا۔ مادے کی جیت ہوئی اور اس نے انسان کو ایک حرص خام اور تشنگی دوام دے دی، یہاں تک کہ زنجیروں میں جکڑ کے زندان ہوش میں بند کر دیا۔ انسان کہیں کا نہ رہا، نہ دنیا کا، نہ دین کا۔ وہ زمان و مکان کا زندانی بن گیا تو اس سے حکمرانی کا سرور بھی چھین لیا گیا۔ اور اس کا حشر یہ ہوا کہ ؎

جو دل تھا الوہیت کا ڈیرا
آکر اسے خواہشوں نے گھیرا

جمیلؔ مظہری تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اے وائے غرور خالقیت
سارا وہ شعور خالقیت

ہونے لگا صرف رنگ و بو پر
صدقے ہوئی عقل آرزو پر
جوں جوں ہوئی سخت یہ غلامی
بڑھتی گئی دل کی تشنہ کامی

انسان اس روئے زمین پر اس لئے اتارا گیا کہ تسخیر کائنات کر کے اپنی حقیقت کا عرفان حاصل کر لے، لیکن زمین پر اترنے کے بعد اس پر جبلی محرکات کا غلبہ ہوگیا جس کے نتیجے میں آزاد شخصیت کا مالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔ حاکم کی گردن، محکومیت کے طوق گراں بار سے جھک گئی۔ اس طرح حکمرانی کا جو فرض تھا، وہ ادا نہ ہوسکا۔ تخلیق آدم کا جو اصل مقصد تھا، اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔ جیسا کہ جمیل مظہری کے درج ذیل اشعار سے واضح ہے ۔

لیکن جو تھا حق حکمرانی
کہتے ہیں جسے نگاہ بانی
وہ فرض ادا ہوا نہ تم سے
آسودہ خدا ہوا نہ تم سے
تم میں اس کی صفت نہ آئی
وہ شان ربوبیت نہ آئی

یہی وجہ ہے کہ انسان پامال ہے۔ کوہ و دشت پامال ہیں۔ فطرت کے تمام مظاہر و موجودات پامال ہیں۔ سب کچھ گردش زمانہ کے زیر فرمان ہے جبکہ گردش زمانہ کو بھی انسان ہی کا تابع فرمان ہونا چاہئے تھا۔ اس صورت حال میں گردش زمانہ کو انسان کیسے بدل سکتا ہے۔ بقول شاعر ۔

بدلا نہ جب اپنا کارخانہ
کیا بدلوگے گردش زمانہ

یہ تو تکمیل خودی کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ اقبال کا خیال ہے۔ جب کہ جمیل مظہری کے خیال میں خودی کا یہ عالم ہے کہ اسے ترک نہ کیا جائے تو تشنہ کامی اور ترک کر دیا جائے تو نتیجہ غلامی ہے۔ یعنی خودی کو حالت اعتدال کی ضرورت ہے اور اس کا راز تہذیب خودی یا تربیت خودی میں مضمر ہے کیوں کہ

بقول جمیلؔ ؎

نار اس کی ہے اصل نور بنیاد
یہ خود ہے ربوبیت کی اولاد

اور اقبالؔ کے خیال میں یہ اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔ عمل یا عشق سے اس کی تہذیب و تربیت ہوتی ہے۔ جمیلؔ مظہری کی زبان میں یہی شق دل گدازی ہے جو تہذیب خودی کے لئے ضروری ہے۔ نیاز و بے نیازی یعنی خودی اور خدا میں اسی سے ربط پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ جمیلؔ مظہری کے درج ذیل اشعار سے واضح ہے ؎

ہے بس کہ یہ مشق دل گدازی
اک ربط نیاز و بے نیازی
تادیب محرکات ذاتی
تخریب تعینات ذاتی
ہر لحظ جو اس میں معرکے ہیں
تہذیب خودی کے مرحلے ہیں

اقبالؔ نے بھی تربیت خودی کے مراحل مقرر کئے ہیں جو تین ہیں (۱) دستور الٰہی کی اطاعت (۲) ضبط نفس جو شعور ذاتی یا انانیت کی اعلیٰ ترین شکل ہے (۳) نیابت الٰہی، جس کی خبر اِنّــــی جاعِلی فی الآرضِ خلیفة میں دی گئی ہے۔

جمیلؔ مظہری نے بھی تہذیب خودی کے مرحلے کی نشاندہی کی ہے اور طریق کار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے خودی کو ربوبیت کی اولاد قرار دیا ہے اور اس کی اصل کو نار اور بنیاد کو نور بتایا ہے۔ اس سے ان کی مراد غالباً خودی کی شانِ جلالی اور شان جمالی ہے۔ اس میں وہ تناسب، توازن اور ہم آہنگی کے قائل ہیں تا کہ اس کا مزاج معتدل ہو جائے۔ خودی اگر محض جلال ہے تو گویا اس پر نار کا غلبہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

تم نور سے نار کو دباؤ
مٹی سے شرار کو بچاؤ

یہ کیوں کہوں کہ موت دو خودی کو
دو معرفت اس کی گمرہی کو
اتنی کہ وہ رام کو سمجھ لے
اور اپنے مقام کو سمجھ لے

اس طرح جمیلؔ مظہری خودی اور خودشناسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی فکر، فکر اقبالؔ سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے کیوں کہ بقول اقبالؔ۔

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

یہاں گردش روزگار کی معنی خیزی بھی توجہ طلب ہے۔ جمیلؔ مظہری کے درج ذیل شعر میں بھی ''گردش زمانہ'' ایسی ہی معنی خیزی اور اہمیت کی حامل ہے جو تصور خودی اور تصور زمان کے داخلی، باہمی ربط کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔

بدلا نہ جب اپنا کارخانہ
تو کیا بدلوگے گردش زمانہ

یعنی جب تک خودی کی تہذیب و تکمیل نہیں ہوگی تب تک انسان گردش زمانہ پر قادر اور متصرف نہیں ہو سکے گا، جب کہ مقصد گردش روزگار یہی ہے۔ خودی آخر کب تک زمانے کے دریا میں بہتی اور اس کی موجوں کے ستم سہتی رہے گی۔ دراصل خودی کی تہذیب و تربیت میں، اس کے جوہر کو نکھارنے میں زمانہ بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بقول اقبالؔ۔

زمانہ باز بر افروخت آتش نمود
کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

اقبالؔ نے خودی کا فلسفیانہ نظام مرتب کرنے کے لئے جہاں علمائے فلسفہ اور حکمائے طبعیات کے تصورات سے استفادہ کیا ہے، وہیں قرآن مجید سے بھی مدد لی ہے۔ قرآن میں زمانے کی تفہیم کے لئے دو عبارتیں ''عصر'' اور ''دہر'' کا ذکر آیا ہے۔ عصر زمان محض اور مسلسل ہے جب کہ ''دہر'' زمان اضافی اور منقسم ہے۔ یہ لمحات میں بٹا ہوا ہے جس کی مجموعی عبارت ماضی، حال اور استقبال

ہے۔اس طرح زمانے کی دو جہتیں قائم ہوگئی ہیں پہلی جہت، عصر کی ہے اور سورہ عصر میں یہ بات کہی گئی ہے کہ قسم ہے زمانے کی کہ انسان بے شک بڑے گھاٹے میں ہے۔غالباً زمانے کی یہی جہت غالب کے پیش نظر تھی جس نے یہ شعر کہلوایا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

لیکن ''سورہ دہر'' میں یہ کہا گیا ہے کہ ''کیا کبھی انسان پر پڑا وقت میں کوئی لمحہ ایسا جب وہ یاد کئے جانے کے قابل کوئی شئے نہ تھا۔'' یعنی منقسم یا لمحاتی زمانے میں انسان گھاٹے میں نہیں ہے کیوں کہ ''دہر'' کے ہر لمحے پر اس کی یاد کی مہر ثبت ہے۔بقول پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی۔

اسی ایک صفحہ دہر میں ہیں گزشتہ ساری کہانیاں
مرا ماجرا بھی لکھا ہوا ہے مگر بخط غبار ہے

ایسا اس لئے ہے کہ دہر انسان کے دائرہ تسخیر میں ودیعت ایزدی ہے۔مگر جب تک اس کا اضافی وجود باقی ہے، زمان محض کی جہت سے وہ یقیناً گھاٹے میں ہے۔

''عصر'' اس کے برعکس ''ازل سے ابد تک رم یک نفس'' ہے۔اس میں لمحاتی تقسیم نہیں ہے، اس لئے جب گفتگو اضافی خودی کی ہوگی اور رمقابلہ عصر کا ہوگا تو خودی گھاٹے کا سودا ہے، لیکن یہی خودی جب دہر کے مقابلہ میں ہوگی تو ۔

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید ، آسماں اس کا صید

ایسا اس لئے ہے کہ زمین و آسمان دہر کی اضافیت سے متعین اور مرتب ہوتے ہیں زمانے کے اسی نظریہ سے اقبالؔ نے خودی کی دو سطحیں مقرر کی ہیں۔محض خودی اور اضافی خودی۔اسی طرح ''عصر'' اور ''دہر'' کے لئے ''زمان محض'' اور ''زمان اضافی'' کی اصطلاحیں وضع ہوتی ہیں۔

خودیٔ محض سرِ کن فکاں اور ضمیر جاں ہے۔یہی خودی آفاقی لامکانی اور لازمانی ہے۔یہی تحریک مسلسل ہے اور ہر وجود اضافی اسی کی شان ہے۔کل یوم ھوفی شان ،اس کی ہر نئی دھج اضافی ہے جب کہ اس کی ذات محض ہے۔کیوں کہ و یبقیٰ وجہ ربك ذ والجلال و الاکرام خودی

محض جولا مکانی اور لا زمانی ہے اور محیط بر آفاق یا محیط بر کل ہے، وہی ۔

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس پیش سے

اور یہی خودی ''ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر'' تا کہ خود کو خاکی وجود میں دیکھ سکے۔ اسی لئے بقول اقبالؔ ۔

ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکئے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بو ست

یہاں خودی اضافی ہوگئی کیوں کہ ۔

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت
خودی کی ہے یہ منزل اولیں

اس ظہور یا قرآن کی زبانی میں ''شان'' کا مقصد یہ ہے کہ خودی کی اضافیت میں اس کی محضیت کی آگاہی ہو جائے۔

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اور جمیلؔ مظہری کی ''آب و سراب'' میں بھی اسی مقصد کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی سرمایہ داری، جمہوریت اور مذہبی ریاکاری کو رد کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے جس طرح دل کی دیرینہ بیماری یعنی نا محکمی کے لئے ''آب نشاط انگیز'' کی جستجو کی، اسی طرح جمیلؔ مظہری نے مادے کی کثافت کو لطافت سے روشناس کرانے کے لئے ''آب آفریں'' کا تصور دیا ہے۔ جس کا مفہوم بہ اعتبار نتائج ایسی محبت ہے جسے

روحانیت کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے جو ایں و آں کو خود میں اس طرح سمیٹ لیتی ہے جیسے دریا کا پانی، کثافتوں اور غلاظتوں کو بھی اپنی روحانی سے شفافیت اور لطافت عطا کر دیتا ہے۔

جس طرح اقبالؔ کے نظام فکر میں قدیم متصوفین، شعرا اور متکلمین سے جدید مفکرین بالخصوص حکمائے طبعیات اور علمائے مابعد الطبعیات مثلاً آئن اسٹائن، برگساں اور وھائٹ ہیڈ وغیرہ کے افکار کی جھلک ملتی ہے، ویسی ہی جھلک ہادیان محبت اور پیروان انسانیت کی جمیلؔ مظہری کی "آب و سراب" میں بھی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مسیح، گوتم بدھ، زرتشت، کنفیوشش اور کربلا کے ایک نہایت ہی اہم کردار عابد بیمار سید سجاد کے حوالے بطور خاص اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ بعض اشعار سے تشکیک کے پہلو ابھرتے ہیں جس کا احساس خود جمیلؔ مظہری کو بھی ہے اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے، لیکن طبعیات کی جدید تحقیق کے جو نتائج سامنے آئے، ان سے مذہب، فلسفہ اور شاعری کے لئے بھی امید کی ایک نئی کرن پھوٹی۔ اس سے اقبالؔ و آزادؔ اور جمیلؔ مظہری نے بھی اپنی بصیرتوں کے چراغ کی لو تیز کی۔ موسم فکر و نظر کی اس تبدیلی نے بادِ نو بہاری کا پیغام دیا۔ وہ جمیلؔ مظہری کے لئے بھی فال نیک تھا۔ انہوں نے خود اس سے تحریک حاصل کی اور ایک نئی امید اور نئے عزم کے ساتھ کاروان حیات کو مہمیز کیا:

گھیرے تھا جو مادے کا لشکر
میدان سے ہٹ چکا ہے یکسر
قبضہ ہے تمہارا لا مکاں تک
مہتاب سے لے کر کہکشاں تک
تقدیس جھکا رہی ہے پرچم
پھیلائے ہے گود عرش اعظم
راز اپنے اگل چکی ہے فطرت
سمت اپنی بدل چکی ہے فطرت
مختار بہ آب و خاک ہو تم
تقدیر پہ فتح یاب ہو تم

محکوم تمہارے ہیں کل اضداد
مٹھی میں ہے روح آتش و باد

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جمیل مظہری نے مثنوی میں قصہ پن کے ساتھ تخلیق وتعمیر کائنات کا ایک مسلسل نظریہ پیش کیا ہے جو مقصدی ہے۔ وہ حیات کو نہ تو اتفاقی نمود مانتے ہیں اور نہ خودی کو خوں ریز وخوں آشام سمجھتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک حیات، تعمیر، تخلیق اور تربیت نفس اور تہذیب خودی کا، ارادے کی نیکی اور پاکیزگی کا مسلسل عمل ہے جس میں جارح اور غیر صالح جبلی محرکات نے اکثر روڑے اٹکائے ہیں، لیکن شعور، وجدان اور تجربے نے ایک ایسا مفاہمانہ موڑ لے لیا ہے جو بہتر امکانات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ فکر وفلسفہ، قصہ کہانی اور شاعری کے لحاظ سے بھی ''آب وسراب'' ہی اقبال کے بعد ایسی مثنوی ہے جو ساقی نامہ کے معیار کو چیلنج کے طور پر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

رانا غلام شبیر

اقبال اور وحدت اسلامی

بیسویں صدی عیسوی میں جب ظالم اور سفاک استبدادی قوتوں نے ملت اسلامیہ کو ناقابل اندمال صدمات سے دوچار کر دیا اور ان کی مکروہ چالوں نے ملت کو منتشر کر دیا تو اس وقت افکار اقبال کی قندیل نے ظلمت شب میں منزل کی طرف رہنمائی کی۔ اقبال نے مسلمانان عالم کے مسائل کا عمیق مطالعہ کیا اور وحدت اسلامی کا تصور پیش کیا۔ اسلام کا ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے ارتکاز (Centralization) وہ عظیم الشان تصور ہے جس کے اعجاز سے اسلام ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے نہ صرف زندہ رہا بلکہ نشوونما پائی۔ بادی النظر میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ زمانہ ہر لمحہ منقلب ہو رہا ہے۔ اقبال نے زمانے کے انقلابات کو دیکھتے ہوئے ملت اسلامیہ کے مسائل کا حل تجویز کیا۔ انہیں احساس تھا کہ قوموں کی زندگی کن قوتوں کی رہین منت ہے۔ جب تک قلب اور روح آزادی اور اتحاد کے لئے اپنے اندر تڑپ محسوس نہیں کریں گے، وحدت اسلامی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ قومیں جب انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں تو وہ قعر مذلت میں جا گرتی ہیں۔ اس تحت الثری سے نکلنے کی کوئی راہ موجود نہیں ہوتی۔ افراد کی ذہنی زندگی کا ملی شعور سے گہرا تعلق ہے۔ اور یہی تعلق رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر دیتا ہے۔ اس کا اظہار عمل اور تخلیق مقاصد کے ذرائع سے ہوتا ہے اور عمل کی توجیہ تاریخ ہے۔ اقبال نے شہنشاہیت اور استعماریت کو لائق استرداد قرار دیتے ہوئے ملت اسلامیہ کو اس کے مسموم اثرات سے خبردار کیا۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقبال نے وحدت اسلامی کا جو فقید المثال تصور پیش کیا اس کی اساس اسلام کے عالم گیر پیغام پر ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے خدا کی رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اس طرح ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مسلمان ایک امت واحدہ ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی جو خود کسی قوم میں کبھی جذب نہیں ہوسکتی۔ اقبال نے وحدت اسلامی کو روح انسانی کا جوہر قرار دیا۔ ملت اسلامیہ کا فکری منبع اسلام ہے۔ اقبال نے ملی اتحاد کو عملی زندگی کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ انسانیت کے شرف اور کاملیت کا انحصار ملی وحدت پر ہے۔ مسلمانوں کے زوال اور جمود کی سب سے بڑی وجہ باہمی اختلافات ہیں۔ باہمی آویزشوں، خونریزیوں اور خانہ جنگیوں نے ہمیں یہ دن دکھائے کہ اسلام کا عملی پہلو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور یہ نکتہ ہم نے فراموش کردیا کہ اعمال کی وحدت کے بغیر افکار کی وحدت تشنہ تکمیل رہتی ہے۔ وحدت اسلامی کے سلسلہ میں اقبال کے افکار اذہان کو ہمیشہ مستیز کرتے رہیں گے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصولوں پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے نہ رہیں گے''۔

اقبال نے اسلامی قومیت کو مروج اور مقبول بنانے کی جدوجہد کی اور وطنی قومیت کو شدت سے ناپسند کیا۔ تاریخی روایات اور ثقافتی ورثے کے اعتبار سے مسلمان ایک قوم ہیں اور قرآن حکیم میں بھی مسلمانوں کیلئے ''امت'' کے سوا اور کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اسی لئے اقبال نے کہا۔

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

ملت واحد کا تصور ہی یہ ہے کہ یہ بتان رنگ وحوں کو توڑ دیتی ہے۔ ہر قسم کے لسانی، نسلی اور وطنی تعصبات کا قلع قمع کردیتی ہے۔ اس کے بعد ایک نیا اور مشترک گروہ متشکل ہوتا ہے جس کی کاملیت اور وحدت ملت کیلئے سرمایہ افتخار ہے۔ اقبال نے اسلامی قومیت کے شعور کو اس طرح اجاگر کیا کہ یہ شعلہ قلب ونظر کی تسخیر کا ضامن بن گیا اور اس کی ضیا پاشیوں سے اکناف عالم کا گوشہ گوشہ منور ہوگیا۔ مغرب کے استحصالی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے اقبال نے جہد وعمل کا پیغام دیا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ امت اپنے وجود میں ایک اکائی بنے اور اتحاد کا یہ عمل مسلمانوں کا باہمی اشتراک عمل کا وسیلہ بن جائے۔ نیشنلزم کا مغربی تصور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اقبال نے اسے مسترد کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ

مغربی استعمال کا یہ حربہ نفرت آفریں اور عداوت خیز تصورات کی قبیح شکل ہے۔ ملت اسلامیہ کیلئے یہ انتہائی مضمر اور تباہ کن ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے وحدت اسلامی کیلئے قومیت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کی طرف توجہ دلائی اور کلمہ توحید اور انسانی اخوت کو قیاس العمل قرار دیا۔ جس کا استحکام نظام رسالت ونبوت نے کیا ہے۔ اقبال نے وحدت اسلامی کو ایسا واحد عملی طریقہ کار قرار دیا ہے جس کے اعجاز سے نوع انسانی سکون قلب اور راحت سے متمع ہوسکتی ہے۔ وطن کے بارے میں اقبال کے خیالات نہایت واضح ہیں۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کو مسلمانوں کی پس ماندگی اور اقتصادی زبوں حالی کا شدت سے احساس تھا۔ استبدادی قوتوں کی ریشہ دوانیوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا تھا۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جارہا تھا کہ وہ برابر روبہ انحطاط ہیں۔ ان حالات میں اقبال نے وحدت اسلامی کا جو تصور پیش کیا، وہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا بلکہ اس کے وسیلے سے ملی اتحاد کی عملی صورت بھی سامنے آئی۔ اور اسلام کے معاشرتی نظام کی تشکیل کے امکانات روشن ہوگئے۔ انہوں نے وحدت اسلامی کو اقتضائے وقت قرار دیتے ہوئے کہا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اقبال کے نزدیک ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ ملت افراد کا مجموعہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ فرد کے مقابلے میں زیادہ گراں بار ذمہ داریوں کی حامل ہے۔ وحدت اسلام کا راز توحید پر کامل ایمان اور ایقان میں مضمر ہے۔ اس کیلئے یہ امر ناگریز ہے کہ فکر و

عمل میں اتحاد پیدا کیا جائے تا کہ انتشار و پراگندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اقبال نے توحید کے وحدانی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔

وحدت اسلامی کا راز توحید ہی میں مضمر ہے۔ اگر توحید کی نشر و اشاعت کا اہتمام ہو جائے تو ملی وحدت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی۔ یہ توحید ہی ہے جس کے فیض سے ملت اسلامیہ نے کائنات کو اپنے علم و فضل سے آشنا کیا اور قیصر و کسری کے استبداد کا خاتمہ کیا۔

وحدت اسلامی کی جتنی آج ضرورت ہے اتنی کبھی نہ تھی۔ اس وقت عالم اسلام گوناگوں مسائل کی زد میں ہے۔ اسلام میں قومی وحدت کے بارے میں واضح نصب العین کا تعین کیا گیا ہے۔ اقبال کا مطمع نظر یہ تھا کہ اس وقت تک اسلامی وحدت اور قومیت کے بارے میں صحیح شعور اور مثبت انداز فکر اجاگر نہیں کیا جا سکتا جب تک اسلامی تعلیمات سے کامل آگاہی میسر نہ ہو۔ اسلامی اتحاد کی راہ میں آمریت اور مذہبی عصبیت سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وحدت اسلامی کی حقیقی روح کو سمجھانے کی غرض سے اقبال نے مسلمانوں کو بڑی دردمندی کے ساتھ مقام محمدیؐ کی طرف توجہ دلائی۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے عظیم علمبردار تھے۔ حریت اسلامی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں ان کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ خدا کو یکتا و یگانہ تسلیم کرنے والی امت کے اتحاد کو یقینی بنانا وقت کی آواز ہے۔ اور اقبال نے اس نصب العین کو خوب اجاگر کیا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرین ہے اس کا وہ مذہب کا کہن ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں ہر قسم کے تعصبات کو لائق استرداد ٹھہرایا۔ وحدت اسلامی سے مراد اقبال کے نزدیک تمدنی و تہذیبی یکجہتی اور مثبت ملی شعور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اسلامی قومیت کے بارے میں واضح موقف اختیار کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ کے بہترین مفاد میں گردانا۔ اسلام کا اعزاز و امتیاز یہ ہے کہ یہ دین و سیاست کا ایسا حسین امتزاج پیش کرتا ہے کہ اخلاقی اور روحانی نظام اس سے مزید نکھرتے چلے جاتے ہیں۔ جب یہ تصور فروغ پائے گا تو اقبال کے تصور کی اہمیت کھل کر سامنے آجائے گی۔ اسلام نے مذہب کے بارے میں کوئی جامد تصور پیش نہیں کیا بلکہ وحدت اسلامی اور انسانی برادری کی یکجہتی کا سرچشمہ عقیدہ توحید ہی ہے۔ جس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ قرآن حکیم میں بھی توحید کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سورہ اخلاص میں ارشاد باری تعالی ہے۔

ترجمہ: ''بتادو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے''۔

اقبال کا پیغام قرآن حکیم ہی کی حیات آفریں تعلیمات پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی اخوت کا جو پیغام اقبال نے دیا ہے وہ قرآن کی حقیقی اور ابدی پیغام سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔ جب تک مسلمان قوم متحد نہیں ہوتی۔ لادینی قوتوں کا مقابلہ کرنا انتہائی کٹھن مرحلہ ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو ایک عالم گیر ملت کی حیثیت سے اقوام عالم کے سامنے پیش کیا۔ اقبال کے ملی شعور اور قومی وحدت کی کوششوں کے بارے میں ممتاز عالم، دانشور اور سابق صدر اسلامی جمہوریہ ایران سید علی خامنہ ای رقمطراز ہیں:

''اقبال ایک عظیم شاعر ہیں۔ وہ ایک عظیم مصلح اور حریت پسند ہیں اور اگرچہ حریت پسندی اور سماجی اصلاح میں اقبال کا رتبہ بہت زیادہ اہم ہے لیکن اقبال کو صرف سماجی مصلح نہیں پکارا جاسکتا کیونکہ اس برصغیر میں اقبال کے ہم عصروں میں کچھ ہندو اور مسلمان لوگ ہندوستان کے سماجی مصلح مانے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کو ہم پہچانتے ہیں''۔

اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال، شاعر اور مصلح کے علاوہ اور بہت سی صلاحیتوں سے بھی متمع تھے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ملت اسلامیہ کی شکستہ کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں، ان کے اعجاز سے اقبال، ملت اسلامیہ کا اقبال بن گئے۔ اقبال نے وحدت اسلامی کے سلسلہ میں روایات کی حیات بخش اور زندہ اقدار کی اس طرح ترجمانی کی کہ انسانی وقار اور آزادی کو نیا جذبہ اور تڑپ نصیب ہوئی۔ ان کی شاعری میں ملت کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات کو نئی تابندگی نصیب ہوتی ہے۔ علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات کے خلاف اقبال کی آواز ایک ایسے رویئے کی مظہر ہے جس کے ذریعہ سے عوام، قوم، ملت، وطن، حتی کہ پوری کائنات اور انسانیت سے ان کا تخلیقی رشتہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے وحدت اسلامی کی خاطر ظلم کے خلاف حرف صداقت لکھ کر حریت فکر کا اعلی معیار پیش کیا۔

اقبال نے ریاستی جبر، مذہبی جبر اور معاشرتی جبر کے ہر انداز کو لائق استرداد ٹھہرایا کیونکہ جبر کی یہ قبیح صورتیں ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔ فقیہان حرم کا منفی کردار اقبال کے نزدیک ہمیشہ ناپسندیدہ رہا ہے کیونکہ ان کی محدود سوچ نے مذہب کو چیستان

بنادیا اور وسیع القلبی عنقا ہوتی چلی گئی۔ حضور ختم المرسلین کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے ملت اسلامیہ کو اتحاد اور یک جہتی کا درس دیا مگر المیہ یہ ہوا کہ جب ذاتی مفادات قومی مفادات پر غالب آ گئے تو ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ محمد بن قاسم جب برصغیر میں آیا تو بدھ مذہب کے پیروکاروں نے مسلمانوں سے تعاون کیا۔ یہ ملی یک جہتی اور اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا اعجاز تھا کہ فرسودہ مقامی تہذیب کی جگہ ایک نئی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اسلام نے اتحاد اور اخوت کا جو پیغام دیا وہ مختصر عرصہ میں سرحد، پنجاب، میرٹھ اور نواح دہلی تک پہنچ گیا۔ حتی کہ راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ یہ اسلام کے پیغام اخوت اور جذبہ ملی کا کرشمہ تھا کہ دنیا بھر میں اسلامی تعلیمات کا بول بالا ہوا۔ البیرونی لکھتا ہے:

''اسلام کے ادارے کتنے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ہندو رسوم وقوانین کا تضاد اپنی تمام تر خرابیوں کے وجہ سے اتنا ناقص ہے کہ ان کا اسلام سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا''۔

اقبال نے قومی احساسات کو اس انداز میں موضوع سخن بنایا کہ عصری رجحانات کو ان میں اہم مقام حاصل ہے۔ اقبال کی آواز دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کی آواز بن جاتی ہے۔ حضور ختم المرسلینؐ کے ساتھ ان کی دلی وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ توحید ورسالت پر کامل ایقان کو ملی اتحاد کا اہم وسیلہ تصور کرتے تھے۔ اور عشق رسولؐ کو مسلمانوں کیلئے ایسا نسخہ کیمیا سمجھتے تھے جو دلوں کو مرکز مہر وفا کرنے کا ذریعہ ہے۔

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشان ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستان ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہوجا
نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

اقبال کی شاعری آفاقی صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے اور تاریخ کی نسبت زیادہ موثر انداز میں فلسفیانہ اسلوب کو سامنے لاتی ہے۔ اقبال نے مقصد، دلچسپی اور دردمندی کو اس طرح

یکجا کر دیا کہ ان کی شاعری جہد و عمل کی نقیب بن گئی۔ وہ اسلامی تہذیب سے اپنے افکار کو جلا بخشتے ہیں اور آزادی کی نعمت کو اتحاد کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے یقین کو شعار بناتے ہوئے شعر و ادب کے وسیلے سے ادب کو وسیع معنی عطا کئے اور ان کی شاعری زندگی کے بارے میں ارفع شعور عطا کرتی ہے اور بے حسی کی مسموم فضاء کو ختم کر کے یقین کی برکات سے آشنا کرتی ہے۔

یقین ، مثل خلیل آتش نشینی
یقین، اللہ مستی، خود گزینی
سن ، اے تہذیب حاضر کے گرفتار!
غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

بے یقینی کے حالات و واقعات ہمارے لئے تازیانہ عبرت ہیں۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کو تاریخی حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں اس بارے میں خبردار کیا کہ قومی یک جہتی کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں کیونکہ شعوری حال ایک طرح سے کسی حد تک ماضی سے آگاہی کا نام ہے۔ اقبال نے واضح کیا کہ قومی انداز فکر اور ملی سوچ کو پروان چڑھانے کیلئے بہت ریاضت کی ضرورت ہے۔

انہوں نے قوم کو لادینی عناصر کی سازشوں سے خبردار کیا اور واضح کیا کہ اگر قوم کو جدید عصری رجحانات کا ساتھ دینا ہے تو وہ ان تمام عوامل پر نظر رکھے جن کے باعث ملت اسلامیہ کو خلفشار کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ کے بارے میں وہ پختہ شعور رکھتے تھے۔ ان کی شاعری سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ وہ تاریخی شعور سے کام لیں کیونکہ تاریخ بعض واقعات کے بیان کا نام نہیں بلکہ ان کے پس پردہ کارفرما عوامل کی تفہیم اور تجزیئے کا نام ہے۔ اقبال کا یہی اسلوب ملی وحدت کے تصور کو آگے بڑھاتا ہے۔

اقبال نے اس حقیقت کو کھل کر بیان کیا کہ قومی تشخص کو اجاگر کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ان کی وسعت نظر اور خیال و فکر کا پھیلاؤ ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل پر محیط ہے اور جب ان کے افکار کو وسیع تناظر میں دیکھیں تو ان کی سرحدیں آفاقیت کی حدود کو چھو لیتی ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی ، نقصان بھی ایک

ایک ہی سب کا نبیؐ ، دین بھی ، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ایک عظیم اسلامی مفکر کی حیثیت سے اقبال نے وحدت اسلامی کو اپنے افکار کا محور بنایا۔ ان کی شاعری کا منبع قرآن حکیم اور سنت نبوی ہے۔ جب کوئی قوم انتشار کا شکار ہوتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ فکری سطح پر وہ تذبذب اور تشکیک کا شکار ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ تہران کو اگر عالم مشرق کے جنیوا کی حیثیت حاصل ہو جائے تو کرہ ارض کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اس کے اعجاز سے ملت اسلامیہ کے اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کی یہ پیش بینی آج بھی ہمارے لئے بہت اہم ہے اور فکر و نظر کو مہمیز کرتی ہے۔

افکار اقبال کے غائر مطالعے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے توحید پر کامل ایمان کو وحدت اسلامی کا موثر ترین وسیلہ قرار دیا۔ انہوں نے اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات تسلیم کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دل و نگاہ میں تسلیم کا جذبہ پیدا کیا جائے تا کہ ایسی سوچ پروان چڑھ سکے جو قومی یکجہتی کی راہ ہموار کرے۔ اقبال کا کلام ایسا مذہبی صحیفہ ہے جو ملت اسلامیہ کے اتحاد کا نقیب ہے۔

جب انسان رحمت باری کا خواستگار ہو اور اسے اپنے خالق کی عظمت کا یقین ہو تو وہ محتاج ملوک نہیں بن سکتا۔ یہ سوچ اسلامی انداز فکر کو تقویت بخشتی ہے اور مسلمان مصائب و آلام کے گرداب میں بھی اپنے رازق کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ بے نیاز اپنے نیاز مندوں کیلئے اپنا دست کرم کشادہ کر دیتا ہے۔ فرمان خداوندی ہے:

''تم جہاں بھی ہو وہ (الہ) تمہارے ساتھ ہے''۔ (الحدید:4)
''مجھے پکارو (مجھ سے مانگو) میں تمہاری دعا قبول کروں گا''۔ (المومنون:6)

وہ کون ہستی ہے کہ جب بے قرار آدمی اس کو پکارتا ہے تو اس کی سنتا ہے اور اس کی مصیبت

کودور کردیتا ہے۔(النمل:620)

اقبال نے ملت اسلامیہ کوقرآن میں تدبر کی تلقین کی ہے کیونکہ قرآن نے وحدت کا وہ پیغام دیا ہے جوتا ابداذہان کی تطہیر وتنویر کا موثر ترین وسیلہ ثابت ہوگا۔

حرف او راریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندہ ای تاویل نے
نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمتہ للعالمینؐ
گر تومی خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اقبال کی شاعری میں اتحاد ملت کا تصور روح کی عظمت کا امین ہے۔قوت متخیلہ اور احساسات کی رفعت کی بدولت عظمت خیال اور شدت جذبات کی وجدانی کیفیت قلب ونظر کو مسحور کردیتی ہے۔اتحاد کے بارے میں اقبال کی شاعری قومی درد سے معمور ہے اور مشاہدے کا تخیلاتی استعمال اپنے ترفع کی بدولت بہت اہمیت رکھتا ہے۔انہوں نے اپنے پیغام کے ذریعہ قوم کوحرکت و عمل کا پیغام دیا۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات سے مزین ایک حسین گلدستہ اشعار کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور امید کی فضا میں قومی وحدت کا پیغام سناتے ہیں ان کے افکار اسلامی تعلیمات سے کامل ہم آہنگی کے مظہر ہیں بلکہ بسا اوقات توان پر الہامی ہدایات کا گمان ہوتا ہے۔ ان کا استدلال حقائق کواس طرح منکشف کرتا ہے کہ مثبت قومی سوچ پروان چڑھتی ہے۔

ایں در حرف لا الہ گفتار نیست
لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است
لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

توحید ورسالت وہ اہم ذرائع ہیں جن کی بدولت وحدت اسلای کا نصب العین حاصل ہو سکتا ہے۔اقبال نے مسلمانوں کوحریت فکر کا درس دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آزادی ایک

بہت بڑی نعمت ہے اور اسے برقرار رکھنا قومی اتحاد ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اقبال نے تقلید کی روش کو خودکشی کے مترادف قرار دیا۔ وہ قدامت پسندی کے خلاف تھے۔ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جانے کا باعث بنے۔ وہ یہی قدامت پسندی ہے۔ اقبال کی ملی شاعری جس میں وحدت اسلامی کا تصور غالب ہے، فن کی اس معراج کو پہنچ گئی ہے جہاں حسیات کی آئینہ داری اور جذبات کی ترجمانی بہت نمایاں ہے۔ اعلیٰ شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ بلندترین حکیمانہ افکار کی تفسیر اور عارفانہ حقائق کی تشریح کے اوصاف سے متصف ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری نے اتحاد اور آزادی کے جذبات کو اس طرح مہمیز کیا کہ ملت اسلامیہ کیلئے یہ شاعری بانگ درا ثابت ہوئی۔

اقبال حریت فکر کو تو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر لادینیت اور الحاد پر مبنی باطل تصورات کو ہدف تنقید بناتے ہوئے ایسے مذموم خیالات کو شیطانی قرار دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی فکر ہے کہ مغربی تہذیب کی یلغار سے کہیں سادہ دل مسلمان گمراہ نہ ہو جائیں۔

انسانی زندگی بہت بڑی صداقتوں کا مرقع ہے۔ اگر انسان ان صداقتوں سے اثر قبول کرے تو اس کے جذبات و احساسات میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ اقبال کی شاعری نے صداقتوں کو اس طرح ذہنوں میں سمویا ہے کہ جذبوں اور خیال کو ایک نئی جہت نصیب ہوئی۔ اقبال کو احساس تھا کہ ہلاکت آفرینی کا یہ درد مسائل کے بارے میں سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ فرد کی بے چہرگی اور عدم شناخت نے انسانیت کو ناقابل اندمال صدمات سے دوچار کردیا ہے۔ اقبال نے اپنی تخلیقی فعالیت سے لاشعور کی تہوں میں ملت اسلامیہ کو ماضی کے تابناک واقعات کے عظیم الشان اثاثے کا احساس دلایا۔ مسلمانوں کا ماضی گواہ ہے کہ انہوں نے صرف اتحاد کے بل بوتے پر کامیابی اور کامرانی حاصل کی۔

موجودہ زمانے میں ہوس نے نوع انساں کو لخت لخت کردیا ہے۔ آج فرد اخوت اور مروت کے جذبات سے عاری ہوتا جارہا ہے آمریت نے انسانی آزادی کو وہ چرکے لگائے ہیں کہ آج کا انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔

اقبال نے حضور ختم المرسلینؐ کے اسوہ حسنہ کو ملت اسلامیہ کے اتحاد کا اہم وسیلہ ترین قرار دیتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ملت اسلامیہ کو آج بھی اسے مشعل راہ بنانا چاہئے تاکہ صیہونی سازشوں کا

قلع قمع ہو سکے اور ملت اپنی اجتماعی کاوشوں سے خوشحالی اور ترقی کے ثمرات سے مستفیض ہو۔

اقبال اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ مسلمانوں کے جملہ مصائب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بحیثیت قوم انہوں نے اپنی شناخت پر توجہ نہیں دی اور بتاں رنگ وخوں کے طلسم میں گرفتار ہو کر باہم برسر پیکار ہیں۔ مسلمانوں کی اس باہمی آویزش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر لحاظ سے پسماندگی ان کا مقدر بن گئی۔ فرقہ واریت نے اس انتشار کو مزید ہوا دی۔ اقبال نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ سیرت پاک کے درخشاں پہلوؤں کو حرز جاں بنائیں اور دین میں متحد ہو کر سرخرو ہوں۔

امام حسینؓ نے دنیا کو انسانی آزادی کا عظیم الشان معیار فراہم کیا۔ انؓ کا یزید کی بیعت سے انکار واقعتاً حریت فکر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان اس بات پر متحد ہو جائیں کہ آزادی کو کسی قیمت بھی جبر کے تابع نہیں ہونے دیا جائے گا تو اسلامی دنیا میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ 61 ہجری میں میدان کربلا میں نواسہ رسولؐ نے ظالم وسفاک قوتوں کے سامنے جو موقف اختیار کیا وہ حریت ارادہ وفکر کو متحد نہج پر استوار کرنے کا ضامن ہے۔ اقبال کی شاعری میں اس واقعہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ امام حسینؓ کی قربانی نے ملت کو انتشار سے بچا لیا اور جبر کو مسترد کر کے حق و انصاف کا علم بلند کرتے ہوئے انہوں نے دنیا کے لئے لائق تقلید نمونہ پیش کیا۔

اس وقت ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں جن دائمی صداقتوں کا ذکر کیا ہے وہ وحدت اسلامی کی ضامن ہیں۔ ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ اقبال کے افکار کی قدر کرے اور انتشار سے گلوخلاصی حاصل کر کے ملی اتحاد کو نصب العین بنائے۔ عالم اسلام کے اس عظیم فلسفی کا یہ پیغام ہر مسلمان کیلئے لمحہ فکر ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے ، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی!

☆☆☆

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیلِ نو

(ایک علمی نشست کی روداد)

علامہ محمد اقبال کی ساری زندگی امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی بہتری کیلئے غور و فکر میں گزری۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں انہوں نے مدراس میں چند خطبے دیئے۔ ان خطبات میں اقبال نے امت کو جس طرز پر احیائے فکر کی دعوت دی ہے وہ بہت نادر ہے۔ اقبال نے مسلم فکر کے تمام پہلوؤں کو از سر نو تشکیل کرنے پر زور دیا ہے اور اقبال کا یہ فکر اپنے متقدم مفکرین و مصلحین سے مربوط ہے۔ شاہ ولی اللہ، فرزندان ولی اللہ، جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خان اس فکری تجدید کے بڑے نمائندے ہیں۔ اقبال نے اسی فکری سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ جس طرح ان لوگوں نے اپنے ادوار میں کھڑے ہو کر قومی اور عالمی تناظر پر نگاہ ڈال کر ایک رائے قائم کی اقبال نے بھی حالات کے پیش نظر یہ فریضہ انجام دیا اور امت کو ضعف و اضمحلال اور سستی و کاہلی سے نجات حاصل کر کے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی طرف بلایا۔ اقبال کے یہ خطبات ایک تجدیدی شخصیت کے افکار ہیں ان کو اسی تناظر میں دیکھا، پڑھا اور سمجھا جانا چاہئے اور اقبال جہاں تک اپنی رائے کو پہنچا سکے ہیں اس سے آگے چلنے کی ہمت، جرأت اور صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔

علامہ محمد اقبال کے یوم وفات ۲۰۰۶ء کے موقع پر پاکستان ٹیلی ویژن، لاہور اسٹوڈیو میں ایک علمی نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں لک کے نام اور اصحاب علم و دانش نے علامہ اقبال کے معروف خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ اس محفل میں جہاں فرزند اقبال جناب ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب

مرکزی مقرر کی حیثیت سے شریک تھے وہاں ان کے ساتھ جناب ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب محمد سہیل عمر، جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب شہزاد احمد، جناب ڈاکٹر وحید عشرت، جناب ڈاکٹر سلیم اختر اور محترمہ عطیہ سید بھی شریک محفل و گفتگو تھے۔ یہ سبھی شرکا اپنی اپنی جگہ اقبالیات کے ماہرین اور نامور اصحاب دانش ہیں۔نوجوان نسل کے کچھ نمائندے بھی اس محفل میں سامع کی حیثیت سے شریک رہے ۔راقم نے بحیثیت میزبان محفل کا آغاز کیا اور تمہیدی گفتگو کی۔اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے خطبات کے حوالے سے اظہار خیال کیا جس میں اٹھائے گئے نکات اور خطبات کے عمومی مباحث پر تمام شرکاء نے اظہار خیال کیا۔اس محفل میں ہونے والی گفتگو ذیل کی سطور میں نذر قارئین ہے۔

زاہد منیر عامر: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم !السلام علیکم ناظرین!

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے افکار سے ہمارا رشتہ کئی جہتوں پہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ عالمِ اسلام کے مفکر ہیں، ایک بڑے شاعر ہیں اور فلسفی بھی۔ان کی شاعری اور افکار و خیالات کی چند جہتوں کے متعلق آپ گفتگو سنتے رہتے ہیں لیکن آج ہماری محفل ان خطبات The Reconstrucion of Religious Thought in Islam کے حوالے سے ہے۔ ناظرین کرام علامہ نے فرمایا تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

یوں تو ان کی ساری زندگی امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کے فکر و خیال میں گزری ہے لیکن ۱۹۲۴ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے علامہ کے افکار میں ایک نئی جہت کی راہ کھول دی۔ Mohammadan Theories of Finance کے نام پر امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ اجماع نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔علامہ کے افکار کی دنیا میں اس سے ایک سوال پیدا ہوا۔انہوں نے یہ سوال اپنے وقت کے معروف علماء کے سامنے رکھا اور خود اس پر سوچ بچار کرتے رہے، یہاں تک کہ اسی سال انہوں نے ایک تحریر ''اجتہاد فی الاسلام'' کے نام سے لکھی ۔ یہی تحریر ان کے خطبات میں The Principle of Movement in Islam کا روپ پاتی ہے۔

اس کے بعد مدراس کی ایک مسلم اسوسی ایشن نے انہیں اجتہاد کے حوالے سے خطبات دینے کی دعوت دی تو انہوں نے اس تحریر میں دو اور موضوعات کا اضافہ کر کے وہاں تین خطبات پیش کئے۔ یہ خطبات بعد ازاں علی گڑھ کے Strategy Hall میں تین مزید خطبات کے اضافہ کے ساتھ پیش کئے گئے۔ اور پھر یہ کتابی شکل میں The Reconstrucion of Religious Thought in Islam کے عنوان سے مرتب ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی بار یہ کتاب شائع ہوئی پھر اس کتاب کے استقبال میں ہر طرح کا ردعمل سامنے آیا۔ بہت سے لوگوں نے اس پر بہت پسندیدگی ظاہر کی اور بہت سے حلقوں نے اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ کتاب کیا ہے.....؟ اس کے مباحث کیا ہیں.....؟ ان میں کون سے سوالات اٹھائے گئے ہیں.....؟ ان کے بارے میں خود علامہ اقبال نے اپنے خط میں لکھا:

"Six lectures is higly technical work and it requires good acquentance with recent development in modern science and philosophy".

آج کی یہ محفل ان ہی خطبات کے بنیادی مباحث پر غور کرنے کیلئے منعقد کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کے اس نہایت اہم کام کے حوالے سے فرزند اقبال محترم جسٹس ریٹائرڈ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب گفتگو فرمائیں گے اور ان کی گفتگو کے بعد ملک کے دانش ور علماء اور اساتذہ کرام، ماہرین اقبالیات خطبات اقبال کے حوالے سے سوالات کریں گے۔

میں جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے التماس کرتا ہوں کہ وہ The Reconstrucion of Religious Thought in Islam کا تعارف کروائیں اور اس کے محتویات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال : دراصل علامہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے شاعر تھے۔ وہ اسلام کی Renaisance چاہتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم تمدن کے زوال کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟ تاریخ کا نقشہ اگر سامنے رکھا جائے تو اس زمانے میں جب علامہ نے ہوش سنبھالا، ظاہر ہے مسلمانوں میں دو ہی Empires تھیں ایک ترکی کی خلافت اور دوسری برصغیر کی حکمرانی۔ اس وقت مغلوں کو تو زوال آچکا تھا وہ تو ختم ہو گئے۔ جہاں تک ترکی کا تعلق ہے تو ۱۹۲۴ء میں ترکی کی

خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔یعنی سیاسی قوت ختم ہوگئی۔اس زوال کا پس منظر علامہ کے ذہن میں یہی تھا کہ تین ایسی قوتیں تھیں جن کی بنا پر جس مقام پر ہم کھڑے تھے ہم چھائے ہوئے تھے زوال آیا۔وہ تین وجوہات ہیں۔۱۔ملوکیت،اور ملوکیت کے لئے انگریزی میں Arbitarary اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔۲۔ملائیت جس کو انگریزی میں Mullaism کہتے ہیں تیسری وجہ وہ تصوف کو قرار دیتے ہیں۔وہ تصوف جو تنزل کی حالت میں تھا یعنی Decline Sufism یہ تین صورتیں ہمارے تنزل کا باعث بنی ہیں۔اسی بنا پر انہوں نے محسوس کیا کہ مغربی علوم ہم پر حاوی ہوگئے ہیں۔آپ کو علم ہے کہ جس زمانے میں یورپ ترقی کررہا تھا اس وقت ہمارے تمدن میں اتنا تکبر تھا کہ ہم اتنے Entire rational ہو چکے تھے کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔اس لئے ہم نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا کہ مغرب میں جو سائنس اور مشاہداتی علوم کی ترقی ہورہی ہے وہ کچھ حد تک آگے چلی جائے۔ حالانکہ علامہ یہ سمجھتے تھے کہ یورپ میں جہاں علوم میں ترقی ہوئی اس کی بنیاد مسلم فلاسفہ نے ہی رکھی ہے ۔اور حکماء اور فلاسفہ نے ہی جن باتوں پر غور اور فکر کیا وہی یورپ نے ہم سے سیکھا اور اسی پر انہوں نے Progress کی اور یہ اُسی کی Development ہے لہٰذا اگر یورپی کلچر کی مثبت اقدار کو ہم اپنا لیں یا ان سے وہ علم حاصل کرلیں تو وہ کسی Allien تمدن سے کسی اجنبی تمدن سے کچھ مستعار لینے کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ وہی علوم ہیں وہی باتیں ہیں جن پر ہم غور کرتے رہے ہیں وہی باتیں ہم واپس لے رہے ہیں۔

اس اعتبار سے علامہ نے یورپ اور اسلام کے درمیان ایک طرح سے برج بنایا تا کہ ہم ان کے علوم کو اس وجہ سے رد نہ کردیں کہ وہ ہمارے تمدن کیلئے اجنبی کلچر کے موضوعات ہیں یا ان کی سائنسز ہیں۔ان کو نہ لیا جائے تو دوسری طرف ان کو یہ بھی خیال تھا کہ یہ جو مغربی علوم کی یلغار ہے اور خصوصی طور پر اس وقت جو سائنسی علوم تھے۔ٹکنالوجی کی بھی اتنی ڈیولپمنٹ نہیں ہوئی تھی۔ٹکنالوجی کو سمجھ لیجئے ثمر ہے سائنس کا۔لیکن اس وقت جو ان کے نزدیک کوشش تھی وہ یہی تھی کہ جو مغرب سے نظریات کی یلغار ہورہی ہے ان سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کو کیسے محفوظ کیا جائے۔آپ کو شاید اس بات کا احساس ہوگا کہ اس بات کا ذکر حالی کے اشعار میں بھی ملتا ہے کہ اگر نئی تعلیم آئے گی تو اس کے ساتھ الحاد بھی آئے گا اور ان کو فکر تھی کہ کہیں نئی نسل بالکل اسلام سے منحرف نہ ہوجائے.....لہٰذا اس کا.....کسی نہ کسی طریقے

سے انسداد کیا جائے۔اس مسئلہ پر غور وفکر تو اقبال سے پہلے ہونا شروع ہوگیا تھا میں تو یہ کہوں گا کہ سب سے پہلے اس بات کا جس شخصیت کو احساس ہوا کہ حالات بدل گئے ہیں۔کم از کم جنوبی ایشیاء میں تو وہ شاہ ولی اللہ تھے۔ان کے بارے میں ہمارے روایت پسند علماء یا تجدد پسند علماء یا مفکر سب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سب سے پہلی شخصیت جس کو یہ احساس ہوا کہ حالات بدل گئے ہیں وہ یہی شخصیت تھی۔شاہ ولی اللہ کے بعد ہمارے سامنے سرسید آتے ہیں اور سرسید نے ہمیں نئے علوم یا نئی تعلیم کو سمجھنے کیلئے ترغیب دی اور اس پر ہی آپ تصور کرسکتے ہیں کہ ہمارے جو قدامت پسند علماء تھے انہوں نے ان پر کتنے اعتراضات کئے۔اس کے بعد تیسری شخصیت سید جمال الدین افغانی تھے جنہوں نے یہ ترغیب دی کہ مغرب کی طاقت کا جو اصل راز ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ان کے جو مناظرے ہوا کرتے تھے علماء کے ساتھ بالخصوص استنبول اور قاہرہ میں اس میں ہمیشہ وہ علماء پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ آپ نے یہ کہہ کر علم کو محدود کردیا ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی علوم ہی پڑھنے چاہئیں اور ان سے ہی اپنا تعلق رکھنا چاہئے لیکن ان کے خیال میں علم کا کوئی تعلق مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔اسی تفریق کے سبب انہوں نے ہمارے عقلی تصورات کو محدود کردیا ہے۔ایک مثال دیتے ہیں کہ علماء تفسیر قرآن کو تو بجلی کے بلب کی روشنی میں پڑھ لیتے ہیں لیکن کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ بجلی کا بلب کیسے بنا ہے؟ یا یہ روشنی کس طرح آگئی ہے؟ کیا ہم اس روشنی کو بنا سکتے ہیں؟ یہ ایک طرح سے علماء حضرات کو سید جمال الدین افغانی کی تلقین تھی کہ مغرب کی طاقت کا جو اصل راز ہے وہ ان کی مشاہداتی علوم میں ترقی ہے اور خصوصی طور پر Rationalism یا عقلیت پرستی کی ان کے نزدیک جو اہمیت ہے اس کے سبب انہوں نے یہ نیا کلچر Develope کیا ہے۔

اس کے باوجود آپ کو اس بات کا بھی علم ہوگا کہ ان ساری شخصیات پر کسی نہ کسی سبب سے کفر کے فتوے لگے۔سید جمال الدین افغانی پر بھی کفر کا فتویٰ لگا۔اس سے پیش تر شاہ ولی اللہ نے جب قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگا۔اس کے بعد ان کی اولاد میں خاص طور پر شاہ عبدالعزیز نے اردو میں قرآن کا ترجمہ کردیا۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری Conservativeness کی حالت اس وقت یہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔اس کے بعد سرسید احمد خان آتے ہیں۔ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔جب انہوں نے نئی تعلیم کی طرف توجہ

مبذول کی اور آپ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ سرسید کی وجہ سے ہے کہ آپ نے یہ نئی تعلیم حاصل کی۔ اقبال بھی سرسید کے بعد آتے ہیں کیونکہ سید جمال الدین افغانی جب ہندوستانی میں آئے اس وقت علامہ اقبال کی عمر بارہ برس تھی۔ یہ شخصیات کا وہ سلسلہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ نئے تصور کی ضرورت ہے۔ اقبال کا ماحول بھی کچھ اس قسم کا تھا جس میں انہوں نے محسوس کیا کہ ہمارے تمدنی زوال کی وجوہات کیا ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکر اقبال کا Essence یہی ہے کہ وہ کوالٹی کے اعتبار سے، سیاسی اعتبار سے ملوکیت ہو یا آمریت اسلام کی Spirit کے خلاف ہے۔ لہٰذا ان کو جمہوریت سے Replace کیا جائے۔ علامہ نے بہت سے تحفظات کے ساتھ جمہوریت کو قبول کیا ہے۔ ان کے اشعار:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

پر اعتراض کیا گیا کہ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں اور دوسری طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ جمہوریت ایسا نظام ہے جو اللہ تعالی کے احکام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اس کو قبول کر لیا جائے۔ یہ مسئلہ تو تب پیدا ہوا جب علی گڑھ گئے تو علی گڑھ کے طالب علموں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو جمہوریت کو اپنے اشعار میں condemn کرتے ہیں تو آپ کس طرح ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ It is according to the spirit of Islam۔

تو ان کا جواب یہی تھا کہ میرے نزدیک اس کا نعم البدل کوئی نہیں۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ جمہوریت جو انسان کا بنایا ہوا سسٹم ہے اس میں خرابیاں کیا ہیں۔ خرابیاں اپنی جگہ پر لیکن اس کا نعم البدل کوئی نہیں۔ اس کا بدل اگر ہے تو وہ ملوکیت یا آمریت ہے اور وہ اسلام کی Spirit کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے میں نے بہ امر مجبوری ہی جمہوریت کے تصور کو Accept کیا ہے۔ اس سے بہتر اور کوئی تصور ہے نہیں جو انسان نے Evolve کیا اور یہاں بھی اقبال پر اعتراضات کیے گئے کہ اسلام میں تو جمہوریت کا تصور نہیں ہے شورائیت کا تصور ہے آپ جمہوریت کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟

دراصل اسلامی قانون سازی میں یہ امام پر Depend کرتا ہے کہ وہ مشورے کو قبول کرے یا رد کر دے۔ اگر آپ نے ملا عمر اور طالبان کے سسٹم کو غور سے Study کیا ہے تو ان کی Party کا Basis یہی تھا کہ انہوں نے Choose کر کے اپنا امام مقرر کیا۔ اس کو وہ مشورہ دیتے تھے اور وہ چاہتے تو مشورہ قبول کرے، چاہے تو نہ کرے۔ یہ صورت جمہوریت میں تو نہیں ہے کہ اس کے متعلق

اقبال یا قائداعظم سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کیلئے ضروری ہے بہر حال وہ ملوکیت اور آمریت کا توڑ جمہوریت کی شکل میں سمجھتے تھے کہ اس سے یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ آپ دیکھیں کہ Reconstruction کے لیکچرز میں انہوں نے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے کہ جس وقت ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوگیا تو خلیفہ کے جو بھی اختیارات تھے وہ اب Parliment کو حاصل ہوگئے۔ یہ جو Assembly کا Concept ہے یہ بالکل ایک نیا Concept تھا اور کہہ لیجئے کم از کم ترکی میں قبول کیا گیا اور ترکی کا اجتہاد ہی تھا کہ خلافت کے خاتمے کے بعد خلیفہ کے جو سارے اختیارات ہیں Elected Muslim Assembly کو منتقل ہوگئے ہیں۔ اسی اجتہاد کو اقبال نے بھی قبول کیا۔

دراصل ہمارے علماء میں Innovative Thinking, Creative Thinking ختم ہوگئی ہے اور اس کو پر کرنے کیلئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور اقبال اجتہاد مطلق چاہتے تھے، ساری چیزوں کو Re open کرنا چاہتے تھے۔ جو مسائل اپنے اپنے زمانوں میں حل بھی ہو چکے ہیں ان سب کو Open کرنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ اجتہاد مطلق کی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے تھے نہ کہ ایسا اجتہاد جو صرف ان مسائل پر ہو سکے جن پر ابھی تک کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا۔ یہاں پر اس قسم کا جو سلسلہ اجتہاد ہے اس کا بھی اختیار وہ پارلیمنٹ کو دیتے ہیں اور پارلیمنٹ کو ہی اجتہاد کے قابل سمجھتے ہیں۔ تیسری چیز Feudalism کا جہاں تک تعلق ہے، یہاں ہمارے حصے میں جس کو ہم پاکستان کی Fedration کہتے ہیں اس میں کسی نہ کسی شکل میں جاگیرداری نظام رائج ہے۔ یہ Feudalism ہماری سیاست پر بھی ہمیشہ چھایا رہا ہے اور مضبوط بھی ہے ابھی تک اس کو ہم ختم نہیں کر سکے۔ Land Reforms جو بھی آئی ہیں وہ صرف Cosmetic ہیں ان کا کوئی صحیح فائدہ نہیں ہوسکا یوں ہماری سیاست پر انہی کا غلبہ رہا۔ اسی سبب سے ہمارے ہاں جو پیری مریدی کا سلسلہ ہے اس کا تعلق بھی ہمارے Fuedalism کے ساتھ ہے اور اسی Fuedalism کے سبب ہمارے Rural Areas میں تعلیم کو فروغ حاصل نہیں ہوسکا۔ سردار وہاں کے وڈیرے ہوں یا خان وہ نہیں چاہتے کہ ان کے مزارعے Educated ہوجائیں اور وہ اسی وجہ سے قبر پرستی میں مبتلا رہیں گے اور بعض تو ایسے Fuedal Lords بھی ہیں جو پیر بھی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت علامہ نے اپنے اشعار میں کہہ رکھا ہے:

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

یعنی ان تین Negativ Forces نے آپ کی یہ حالت کردی ہے کہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے آپ یہاں کھڑے ہیں۔ علامہ نے تجاویز دیں، مسائل کے حل تلاش کئے لیکن ۱۹۲۴ء میں اقبال نے اجتہاد پر جو خطبہ دیا اس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ مجھ پر کفر کے فتوے لگے کیونکہ میں نے اجتہاد کا ذکر کردیا ہے۔

۱۹۲۴ء کے خطبہ اجتہاد کی کاپی ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے لیکن اس پر بھی ان کی Satisfaction نہیں تھی بعد میں جو خطبہ دیا گیا اور Reconstruction میں شامل کیا گیا وہ اس کی Improved Form تھی اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا تھا۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصل مسئلہ جو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے حضرت علامہ کے سامنے تھا وہ حالی کی نگاہ میں یہ تھا کہ جس وقت نئی مغربی تعلیم آئی تو الحاد پھیل جائے گا اس کو کس طرح روکا جائے۔ علامہ نے اپنی طرف سے فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے اس کو تطبیق دینے کی کوشش کی تھی یعنی مغربی فلسفے کی اور سائنس کو مذہب کے ساتھ اور خصوصی طور پر اسلام کے ساتھ اور یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے لئے مشاہداتی علوم یا تجرباتی علوم Alien نہیں ہیں یا ہمارے لئے Alien Rationalism نہیں ہے۔ اس کے بعد اگلی چیز جو انہوں نے محسوس کی اور جس پر انہوں نے اصرار بھی کیا وہ یہی تھا کہ ہم اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ Alien Thoughts کے ساتھ ہم اپنا تحفظ کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ انہوں نے کس طرح ان مختلف تصورات جو West سے اس وقت Colonial Period کے دوران ہمارے ملک میں در آتے رہے۔ مثلاً Territorial Nationalism Nationalism کو بھی انہوں نے برا کہا کہ نہیں Territorial nationalsim تو مسلمانوں کو قبول ہی نہیں۔ مسلمانوں کی Nationalism کی بنیاد تو ان کی Ideology ہے ان کا ایمان ہے تو علامہ نے اس کو شکل مختلف دے دی یعنی Concepts مغربی ہیں لیکن ان کو Islamize کیا جارہا ہے۔ اقبال کی فکر میں بہت سے Concepts مغربی ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طریقہ سے Islamize ہوجاتے ہیں اور وہ اس کی جو Reasoning دیتے ہیں وہ اتنی Convincing ہے کہ انہوں نے On the basis of Idealism ایک Nation بنادی گو وہ زبان مختلف بولتے ہیں، نسلیں ان کی مختلف ہیں، مختلف جغرافیائی علاقوں میں آباد ہیں لیکن چونکہ ان کی قدر مشترک ایمان ہے اس لحاظ سے وہ ایک Nation ہیں Nation Building میں بھی انہوں نے کہا کہ اسلام ہی آپ کا

Patriotism ہےاوراسلام ہی آپ کاNationalism ہے۔اس بنیاد پرایک قوم وجود میں آگئی ، پہلے تو ایک ہجوم تھا پھر یہ ہجوم قوم کی شکل اختیار کرگیا اور پھر اس کے Territorial specification کا Demand ہوا تو پاکستان بن گیا۔میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ Appearently حضرت علامہ کا جو تفکر تھا اس کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان نوجوان اپنے عقیدے سے نہ ہٹیں۔اب اسی بنا پر یہ خودی کا فلسفہ ہے حالانکہ اس وقت جب انہوں نے تصوف کے خلاف تحریک چلائی، خاص طور پر اسرار خودی کا جو دیباچہ پہلے ایڈیشن پر لکھا گیا اور صوفی حضرات اس پر بہت مشتعل ہوئے اس کا بھی سبب انہوں نے یہی قرار دیا کہ یہ تو سارے مغرب کے Thoughts ہیں جو اقبال ہمارے اوپر ٹھونسنے کی کوشش کررہا ہے۔یہ تصور جوان کا خودی کا ہے یہ تو انہوں نے جرمن فلاسفروں سے سیکھا ہے، یہ تو نطشے کا تصور ہے۔ان حضرات کو اتنا علم نہیں تھا کہ اس قسم کے تصورات انسان کامل کی شکل میں نطشے سے بہت پیشتر ابن باجہ یا الجلیلی کے ہاں موجود ہیں تو یہ اقبال کوئی نئی بات نہیں کررہے تھے۔میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر ہماری Conservative Thinking کی گرفت اتنی سخت تھی کہ No doubt you have personalites like Allama لیکن ہم ان کی Grip سے اب تک نہیں نکل سکے۔اس پس منظر کے باوجود جب علامہ نے کوشش کی تو ان پر بڑے اعتراضات ہوئے۔Reconstruction میں ایک جگہ پر حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد Spiritual Democracy کا قیام ہے لیکن he does'nt define what is spiritual democracy۔اب Spiritual democracy سے ان کی کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ جس وقت عرب نئے نئے مسلمان ہوئے تو چونکہ انہوں نے زمانہ جاہلیت سے نکل کر اسلام قبول کیا تھا لہٰذا ان کو اس **Idea** کا احساس نہیں تھا لیکن درحقیقت جو مقصد اسلام کا صحیح تھا وہ یہی ہے کہ Spiritual Democarcy ~~وجود میں~~ لائی جائے اور آج کل جو مسلمان ہے اس پر یہ فرض اور لازم ہے کہ وہ ایسے Social Contacts میں اسی تصورات کو اپنے سامنے رکھے اور جو Partially Revealed Purpose of Islam ہے اس کو درحقیقت صحیح معنوں میں نافذ کرکے دکھائے۔

جہاں تک Reconstruction کے من حیث التمام لکچرز کا تعلق ہے۔اس کے متعلق بھی علماء کا سخت اعتراض ہے۔اگر آپ اس کتاب کو غور سے دیکھیں تو یہ ایک طرح کا جدید علم کلام ہے۔علم

کلام وہ موضوع ہے جس کا تعلق خدا کی ذات سے ہے۔ یعنی یہ مذہب اور فلسفے کے درمیان یا بین بین ایک موضوع ہے۔ اس میں حشر ونشر کا ذکر ہے۔ اس میں حیات بعد موت کا ذکر ہے اور اقبال کا اصل فلسفہ ہی ایک طرح سے علم الکلام ہے۔ ایک نیا علم کلام اور اسی وجہ سے اس کتاب میں بہت سارے موضوع ہیں جن کو اقبال نے Touch کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ ضرورت جو سمجھنے کی ہے وہ اس میں ان کا وہ لیکچر ہے جس کا تعلق اجتہاد کے ساتھ ہے۔ یعنی The Principal of Movement of Islam اس سے اگلا Is Relegion Possible Chapter ہے، مگر یہ سارے الہیاتی قسم کے موضوعات ہیں جن پر آپ غور کر سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا جو امتزاج ہے علامہ نے اسے ہمارے سامنے اس وقت پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا کتنا Impact ہوا کیونکہ یہ Lectures تو پڑھے ہی نہیں گئے اور اس پر تو بحث ہم آج تک کر ہی نہیں پائے۔ اور اس وجہ سے ابھی وقت ہے کہ ان پر غور کیا جائے لیکن اب ٹکنالوجی جو سائنس کا ثمر ہے اس کی اجازت نہ دیتے ہوں تو جس طرح کے دور میں اب ہم ہیں اس میں اس سے آگے جانے کی ضرورت ہے۔ علامہ نے تو خود اس کتاب کے دیباچے میں کہہ دیا ہے کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کتاب حرف آخر ہے اس کے بعد بھی اس سے بہتر نظریات آسکتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے کبھی اس سے بہتر نظریات لانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی ایسی تحریک نہیں چلی کہ ہمارے نوجوانوں میں اس قسم کا جذبہ پیدا ہو یا اس قسم کی سوچ پیدا ہو جس کو اقبال اجتہادی فکر کہتے ہیں۔ اجتہادی فکر کی ضرورت صرف فقہ کے معاملات ہی میں نہیں ہمارے ہر مسئلہ میں ہے۔ ہمارے Social Contacts میں ہماری Political Policies میں، ہمارے Human rights میں۔ ساری چیزوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہماری نئی نسل اس نکتے کو سمجھ لے۔ یہ گرہ باندھ لے کہ ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ اب یہ نہ سوچے کہ کسی قسم کا خوف ہمارے دل میں ہے۔ ہم کسی خوف کے بغیر اور جرات کے ساتھ قدم آگے اٹھائیں۔ تو جدوجہد غلط بھی ہوجائے لیکن نیت درست ہے تو اللہ تعالی معاف کردے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان باتوں سے متاثر نہ ہوں کہ ہمارے اوپر حدود کیا نافذ کی جاتی ہیں۔ ہم آج سے آگے نکلیں کیونکہ ہم جلدی میں ہیں۔ ہماری نسل جلدی میں ہے۔ ہم جلد اس دنیا میں آگے ہی رہیں گے اور آگے اسی صورت میں رہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے

عقیدے وایمان کوساتھ رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں کوقبول کرلیں۔

زاہد منیر عامر: آپ نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی زبانی علامہ کے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے بنیادی موضوعات سے آگاہی حاصل کی۔ علامہ نے ان خطبات کو جن موضوعات میں تقسیم کیا ہے وہ ہیں: علم اور مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذات الہیہ کا تصور اور مفہوم دعا، خودی، جبر وقدر اور حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح، اجتہاد فی الاسلام اور کیا مذہب کا امکان ہے؟

یہ وہ موضوعات ہیں جن کی طرف ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اپنی گفتگو میں اشارے فرمائے ہیں اور فرمایا ہے کہ بنیادی طور پر اجتہاد کا مسئلہ ان خطبات کی روح سمجھا جاسکتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کی اس محفل میں جو اساتذہ اور علمائے کرام تشریف فرما ہیں ان کا براہ راست تعلق علامہ کے ان خطبات سے ہے۔ میں افسانہ نگار، دانش ور اور استاد ڈاکٹر عطیہ سید سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس گفتگو کے حوالے سے کوئی سوال پیش فرمائیں۔

ڈاکٹر عطیہ سید: ڈاکٹر صاحب نے ابھی مختصراً لیکن جامع انداز میں وہ تاریخی پس منظر بیان کیا ۔اس سارے پس منظر میں اقبال کے افکار نے مسلم سوچ کی نمائندگی کی۔ اب دور حاضر میں بھی ایک Global Situation ہے تو ڈاکٹر صاحب سے میرا طالب علمانہ سوال یہ ہے کہ اس Global Situation میں اقبال کے افکار کی کیا Relevance بنتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں اس کے متعلق تو یہی عرض کرسکتا ہوں کہ اس وقت جو صورت ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے آپس ے جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کردیں۔ جس قسم کے حالات سے اس وقت ہم گذر رہے ہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ہم دیکھیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں جو تعلیمات حضرت علامہ کے ہاں ملتی ہیں۔ ان میں فرقہ واریت سے اور اس کے ساتھ ہی علاقائیت سے منع کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے تو ہمیں اپنے مسائل حل کرنا چاہئے۔

زاہد منیر عامر: جی شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب استاذ الاستاذہ ہیں۔ اقبالیات کی نئی جہات کو منکشف کرنے والے مصنفین میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج کے اس خطبہ کے حوالے سے آپ کیا پوچھنا چاہیں گے؟

خواجہ محمد زکریا: علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کچھ اور انداز کی ہے خطبات کچھ اور انداز کے ہیں یعنی کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے جیسے یہ دو شخصیات ہیں خود علامہ نے بھی کہا ہے

حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار

یعنی خطبات کو حرف پیچ دار قرار دیا ہے تو ظاہر ہے ان کا پڑھنا، ان کا سمجھنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ خطبات پڑھے نہیں جاتے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں اردو میں بھی حتی کہ پنجابی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ خطبات ابھی تک نہیں سمجھے گئے تو کیا طریقہ ہو کہ ان خطبات کی تفہیم عام آدمی کیلئے ہو یا کم از کم دانش وروں کیلئے تو ہو۔

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ حضرت علامہ اپنے اشعار کی دنیا میں مختلف ہیں بہ نسبت اس دنیا کے جو ان کے شخصیت کا تاثر ان کے لیکچرز میں ہے تو غالباً آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ حضرت علامہ نے کہہ رکھا ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور آئندہ آنے والی نسلیں ممکن ہے مجھے شاعر نہ سمجھیں۔ وہ فرماتے ہیں سوائے اس کے کہ میرے ذہن میں چند خیالات ہیں جو میں اپنی قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور انہوں نے نظم کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ بنیادی طور پر ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ جلدی میں تھے اور جلدی میں ہونے کے سبب شعر کا انداز اختیار کیا کہ بجائے دماغ پر اثر کرنے کے دل پر پہلے اثر کیا جائے۔

زائد منیر عامر: ہمارے پاس اس وقت ممتاز شاعر، دانشور اور محقق ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب تشریف فرما ہیں ڈاکٹر صاحب آپ آج کیا اس لیکچر کے حوالے سے کیا پوچھنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر خورشید علی رضوی: اصل میں سوال تو نہیں یوں کہئے کہ ایک Loud Thinking ڈاکٹر خواجہ صاحب کی گفتگو سے اور ڈاکٹر جاوید صاحب کے جواب سے میرے ذہن میں آ رہی تھی کہ جو اقبال کی شاعری اور ان کے لیکچرز میں بظاہر ایک Diacotomy یا تضاد ہمیں محسوس ہوتا ہے اس کے حوالے سے جاوید نامہ کے آخر میں خطاب بہ جاوید اور سخنے بہ نژادِ نو میں چار پانچ شعر لکھے ہیں:

من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف
کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار
تا کنم عقل و دل مردان شکار

تو اس میں انہوں نے خود اس کی وجہ بتائی ہے کہ یہ شاعری جو ہے اس کا تعلق ذکر سے ہے۔ یہ نالہ مستانہ اسرار جنگ ہے یعنی ایک Emotions کی زبان میں بات کرتی ہے اور لیکچرز جو ہیں ان کا تعلق فکر سے ہے تو اس ذکر و فکر کو یکجا کرنا میرا مقصد ہے ۔ اب اس میں جو ہمیں Diacotomy تھوڑی سی نظر آتی ہے کہیں کہیں وہ ذرا زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے مثلاً آج اجتہاد پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ رموز بے خودی میں تو انہوں نے ایک پورا عنوان اس پر قائم کیا ہے کہ در معنی این کہ در زمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولی تر است اور اس میں جتنے شعر لکھے ہیں اس میں انہوں نے یہ زور دیا ہے کہ چونکہ عالمان کم نظر کے اجتہاد سے بہتر ہوتا ہے کہ آپ رفتگان کی تقلید کر لیں اور یہ سچائی سے خالی نہیں ہے۔ یہ اب بظاہر تو ایک تضاد لگتا ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کا جو لیکچرز زیر بحث ہے اس میں بھی یہ Reservation جا بجا جھلکتی ہے مثلاً جب انہوں نے قانون ساز اسمبلی کی بات کی ہے تو صرف یہ فرمایا ہے کہ اس طرح کی اسمبلی مثال کے طور پر ایران میں تشکیل دی گئی جس کے ذریعہ سے انہوں نے کوشش کی ہے تو ہم بھی تشکیل دے سکتے ہیں اگر چہ اس میں یہ خطرہ موجود ہے کہ جو لوگ اس کے اندر شامل ہوں گے وہ Half baked ہوں گے، جو لوگ سیاست کو سمجھیں گے وہ دین کے رموز کو نہیں سمجھتے، جو اس کو سمجھتے ہیں انہیں نہیں سمجھتے تو ان تمام خطرات کا احساس جوان کو رموز بے خودی میں تھا وہ یہاں بھی تھا لیکن یہاں ڈاکٹر صاحب سے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے کہ وہ اجتہاد سے ایک گونہ اندیشہ بھی محسوس کرتے ہیں اور اجتہاد کی طرف بڑی شدت سے مائل بھی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا ایک توازن ہم کہاں جا کر قائم کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں تو صرف اس کے متعلق اتنا کہوں گا کہ جس وقت ہم پر غیر حاکم تھے اس وقت علامہ نے تقلید کیلئے کہا ہے کیونکہ وہ ایک طرح سے اپنے کلچر کی Preservation ہوتی ہے تو اس وقت وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اب ہم اجتہاد کرنے لگیں تو ممکن ہے وہ غلط ہو جائے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیاسی آزادی حاصل کر چکنے کے بعد اب بھی ہم دور غلامی میں ہیں کہ ہم تقلید کو قائم رکھیں۔

زاہد منیر عامر: علامہ نے عالمان کم نظر کی بات کی ہے اور اگر وسعت نظر رکھنے والے علماء کسی انحطاط کے زمانے میں بھی پیدا ہو جائیں تو یہ دروازہ کھلا رہ سکتا ہے۔ ہمارے درمیان پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب تشریف فرما ہیں۔ علامہ اقبال پر درجن بھر کتابوں کے مصنف ہیں، ڈاکٹر صاحب نقاد ہیں ،ادب کے استاد ہیں شاید وہ Reconstrution کے ادبی پہلو پر بات کرنا چاہیں گے؟

سلیم اختر: میں سوچ رہا تھا کہ ۱۹۳۴ء میں خطبات شائع ہوئے اب تک ۷۲ برس ہو گئے ہیں انہیں شائع ہوئے اور ڈاکٹر صاحب ہی کے بقول انہیں ہمارے ہاں اتنا نہیں پڑھا گیا جب کہ یورپ میں شاعری کے ساتھ ساتھ خطبات پر بھی بہت زیادہ دلچسپی لی گئی مثلاً مجھے یاد آ رہا ہے کہ فرانس کی ایک خاتون تھیں ایوا مارچ یووچ انہوں نے شاید یورپ میں سب سے پہلے فرانسسی میں خطبات کا ترجمہ کیا پھر بوزانی نے لاطینی میں کچھ کام کیا اس کے بعد رشیا میں نتالیہ پری گارینا نے علامہ اقبال پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تو انہوں نے بھی ایک باب میں ان کے بارے میں گفتگو کی۔ اسی طرح ترکی میں جرمنی میں اور دیگر ممالک میں English speaking countires میں تو ضرورت نہیں کہ کتاب ہی انگریزی میں ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ علامہ اقبال کے جو جدیدیت پر مبنی خیالات ہیں اور جنہیں ہم شاعری کے حوالے سے اکثر کلیشے میں افکار نو کہتے ہیں لیکن اصل افکار نو ہمیں خطبات میں ملتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا کہ اٹھایا جانا چاہئے تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ خطبات ہماری عقل کو اپیل کرتے ہیں۔ ان کی جو شاعری ہے اور شاعری میں جلال و جمال والا اسلوب ہے وہ ہمارے Emotions کو Appeal کرتا ہے، جذباتی بناتا ہے لیکن خطبات ہم سے جس Hard analysis اور عقلی رویے کی توقع کرتے ہیں بالعموم ہم میں مفقود ہے۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر صاحب یہ الجھن ہے کہ اس وقت تمام یورپ میں، تمام دنیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد، تخریب کار، بمبار قرار دیا جا رہا ہے اور جن واقعات سے وہ سند لیتے ہیں یا جن وجوہ سے مغرب میں یہ تصور پیدا ہوا جو میں سمجھتا ہوں کہ غلط ہے کہ اسلام تخریب کاری کی تعلیم دیتا ہے اور ہماری حدیثیں یا ہمارے علماء یہ باتیں نہیں کرتے ہیں لیکن ایک طبقہ ہے بوجوہ اس نے یہ کیا اور یورپ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تو کیا ایسے میں علامہ اقبال کے افکار اور تصورات اور ان کے خیالات (شاعری بھی اور خطبات کے بھی بہت سے حصوں) کی روشنی میں ہم دنیا کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ بھئی ہمارا مذہب ایسا نہیں ہے۔ ہم ایسے نہیں۔ ہم اپنی ذات میں گناہ گار ہوں گے لیکن اجتماعی قتل و غارت گری

میں ہم Believe نہیں کرتے ہیں۔ اگر چہ اپنے ملک میں بھی ہمیں اس کے مظاہرے مل رہے ہیں۔ ابھی عید میلاد النبیؐ کے مبارک دن جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ عید اور جمعے کی نماز ہم پولیس کے زیر سایہ پڑھتے ہیں وہ ملک جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہاں اسلام کے علاوہ ہمیں ہر چیز نظر آ رہی ہے اور وہی ملک اب اسلام کے نام پر برباد ہو رہا ہے تو ایک ہمارے داخلی مسائل ہیں ایک ہم پر بین الاقوامی طور پر دہشت گرد اور تخریب کار کی ایک Labeling لگ چکی ہے تو ڈاکٹر صاحب آپ اس پر روشنی ڈالئے کہ ہم علامہ اقبال کے فکر کے کن پہلوؤں کو اتنا نمایاں کریں اور مغرب کے سامنے Protest کریں کہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ اسلام ایسا نہیں ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ نے درست فرمایا ہے حقیقت میں علامہ ایک Bridge ہیں اسلام اور مغرب کے درمیان۔ میں آپ کو اس کا پس منظر بتاتا ہوں کہ سہیل عمر صاحب میرے ساتھ تھے۔ غالباً اور شخصیات بھی تھیں۔ جس وقت یورپ میں سب سے بڑی اقبال کانگریس قرطبہ میں ہوئی۔ اتنی بڑی کانفرنس آج تک کم از کم یورپ میں نہیں ہوئی، اس کا افتتاح مسجد قرطبہ میں اسی جگہ پر ہوا جہاں علامہ نے سجدہ کیا تھا۔ اس کانفرنس کا پس منظر یہ تھا کہ اس کا سارا اہتمام کرنے والا ایک فرانسسی شخص تھا جس کا نام Professor lemo ہے۔ وہ بجائے خود گلف سٹیٹس کے حکمرانوں کا ایک وکیل تھا اور ہمیشہ ان کے Cases کرتا تھا۔ ان کو کویت نے کہا کہ ہم اسلام اور مسیحت کے درمیان ایک مکالمہ کرنا چاہتے ہیں کوئی ایسا شخص ہو جو مشرق و مغرب کے درمیان Bridge ہو۔ پہلے تو انہوں نے Naturally سوچا کہ کوئی عرب تلاش کیا جائے۔ کوئی مصری یا کوئی ایسی شخصیت جس کا فکر اس قسم کا ہو جو یہ دعویٰ کرے کہ بھئی جو کچھ بھی مغرب میں اس وقت ہے وہ دراصل مثبت طور پر ہمیں نے ان کو دے رکھا ہے۔ اور ان سے لے لینا کوئی اجنبی چیز لینا نہیں بلکہ اپنی ہی دی ہوئی چیز زیادہ Developed form میں واپس ملنی ہے۔ اس کیلئے آخر قرعہ حضرت علامہ اقبال پر پڑا کیونکہ عرب دنیا میں یا ایران میں کوئی ایسی شخصیت ان کی نظر میں نہ آئی اور کویت اور گلف کے جو امیر تھے انہوں نے کہا کہ ہم اس کو Support کریں گے تم جا کے Organize کرو پھر Lemo نے یہ کانفرنس کی۔ اس وقت غلام اسحاق خان صاحب پاکستان کے صدر تھے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے صدر شریک ہوں اور اسپین کا بادشاہ King Karlos بھی شریک ہوگا۔ صدر صاحب نے پتا نہیں کس مصلحت کے تحت انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ کارلوس نہ آیا اور کانفرنس کا افتتاح کرنے کیلئے مجھے کہا گیا۔ اس کانفرنس میں غالباً

چھتیس یا چالیس مقالے پڑھے گئے۔تقریباً سو سے زیادہ اقبال شناس دنیا بھر سے آئے ہوئے تھے اور اسی بناپر Iqbal is the only person from among the muslim world who can buckled a bridge between the east and west تو یہ کوشش ہم کر چکے ہیں۔علامہ کی اس خصوصیت کی بنا پر مجھے جب بھی کہا گیا کہ آپ آئیں یعنی بین المذاہب ڈائیلاگ میں شریک ہوں میں نے انکار کیا ہے اس وجہ سے کہ ہمارا auttiude appologetic نہیں ہونا چاہئے۔ہم جو ہیں وہ ظاہر ہے۔جو تلاش کرنا چاہئے دیکھ سکتا اور اسے مل سکتا ہے لیکن جس وقت آپ یہ محسوس کریں کہ ہم پر غیروں نے لیبل لگادیا ہے اور ہم اپنی Defence کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیں زیب نہیں دیتا۔ہمیں جو کچھ ہم ہیں، وہ صحیح طور پر جاننے کیلئے انہیں چاہئے کہ جاننے کی کوشش کریں۔

ابھی بنگلہ دیش میں گیا تھا انہوں نے بڑی عزت افزائی کی وہاں بلا کے اور یہی کہا کہ Islam is Religion of peace آپ مقالہ پڑھیں۔میں نے کہا جی میں اس پر کیا مقالہ پڑھ سکتا ہوں۔میں نے کہا میرا پوتا مجھے صبح ملنے آتا ہے تو کہتا ہے دادا جان السلام علیکم اور میں اسے جواب دیتا ہوں وعلیکم السلام بیٹا۔ہمیں تو بچپن ہی سے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ You talk of peace. claim peace of your live peace to the other ہماری تو ابتداء ہی اس طرح ہوتی ہے ہم کیسے محارب ہوسکتے ہیں اور اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنی طرف سے Appologetic ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ نہیں جی ہم تو بڑے اچھے بچے ہیں آپ ہمیں ایسے ہی برا سمجھتے ہو۔

زائد منیر عامر: جی ڈاکٹر صاحب آپ نے فرمایا کہ علامہ نے جو تطبیقی روش اختیار کی وہ اگر آج ہم پیش کرتے ہیں تو Appologetic ہونے کا احساس ہوتا ہے مجھے یاد آیا کہ علامہ جب اندلس کے سفر سے واپس آئے تھے تو لاہور کے شہریوں نے ٹاؤن ہال میں انہیں ایک چائے کی دعوت دی۔وہاں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہی بات کہی کہ تطبیقی روش میں ایک طرح سے کمزوری کا احساس پایا جاتا ہے۔سہیل عمر صاحب تشریف فرما ہیں جنہوں نے اس نکتے پر اپنی کتاب خطبات اقبال نئے تناظر میں میں بحث کی ہے اور علامہ کی اس نصیحت پر عمل کیا کہ فکر کی دنیا میں کوئی شئے حرف آخر نہیں ہوتی، ہمیں چاہئے کہ اس باب میں آزادانہ نقد وتنقید سے کام لیں۔جناب سہیل عمر آپ جاوید اقبال صاحب سے

کیابات کہنا چاہیں گے؟

محمد سہیل عمر: تشکیل جدید کے بنیادی مقدمہ فکر کا بار بار ذکر آیا ہے اور اسے علامہ کے خطوط سے لے کر ان کے زمانے سے اور آج کی گفتگو تک تواتر سے نیا علم کلام کا نام دیا گیا ہے اور خود اپنے خطوط میں بھی ابتدائی دور میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ اب آپ ڈاکٹر صاحب کیا فرمائیں گے کہ Post Renaisance west میں جو مغربی تہذیب پیدا ہوئی ہے اس کا مسلم تہذیب سے فکری تصادم ہونے کے نتیجے میں جو ہمارے ہاں صورتحال پیدا ہوئی اور مسلمانوں کو ایک نئے فکری چیالنج کا سامنا کرنا پڑا یعنی Engagement with Modernity، علامہ اقبال کے خطبات اس کا ایک موثر جواب دینے میں کس حد تک کامیاب کوشش کہے جاسکتے ہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اجتہاد آج کئی حوالوں سے زیر گفتگو آیا ہے میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ نے Reconstruction میں اجتہاد کے بارے میں جو فرمایا اسی سال گزرنے کے بعد آج ان کے وہ فرمودات کس حد تک ہمارے لئے رہنما ہیں؟ ہم نے ان کی اس دکھائی ہوئی راہ پر کس حد تک قدم بڑھایا اور آج مزید کیا کرنے کی ضرورت نظر آتی ہے اس خاص موضوع کے حوالے سے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کامیاب رہے ہیں کیونکہ اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا اور ان کا یہ کہنا کہ مغربی تہذیب دراصل اسلام ہی کی تہذیب کی ایک Extension ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے اس Shyness کو Remove کرنے کی کوشش تھی جو ہمارے ہاں ایک طرح سے خواہ تکبر کی بنیاد پر یا نا اہلی کی بنیاد پر پیدا ہوگئی تھی۔ جہاں تک مشاہداتی علوم کا تعلق ہے علامہ اس سلسلہ میں کامیاب رہے ہیں کیونکہ اگر وہ طریقہ کار Adopt کیا جاتا تو سرسید کی کوشش کافی نہیں تھی یا سرسید اور حضرت علامہ کے درمیان جو شخصیات پیدا ہوئی ہیں مثلاً جمال الدین افغانی کی شخصیت ہے انہوں نے Eminent سے Gain کیا۔ ان کی اپنی تحریریں اس قسم کی نہیں ہیں جیسے علامہ کے Six Lectures ہیں۔ ان کے علاوہ ایک شخصیت مولوی چراغ علی تھے ان کی تحریریں تھیں اور پھر اسی طرح سر امیر علی تھے جو اس زمانے میں مقبول شخصیات تھیں لیکن ان کا Attitude آپ کو یاد ہے

حضرت علامہ نے ہی فرمارکھا ہے کہ Appologetic تھا۔ مولوی چراغ علی کا بھی اور سید امیر علی کا بھی۔ اس تناظر میں تو حضرت علامہ اقبال ہی تھے جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب ہوئے کہ Method of deubt آپ کے ہاں ملتا ہے، French thinkers کے ہاں Decarts کے ہاں، اس کی ابتداء غزالی نے کی ہے۔ Logic کے سلسلہ میں انہوں نے اپنا جو نقطہ نگاہ پیش کیا ہے وہ سارا آپ کو اس کے ہاں ملتا ہے۔ یعنی جو بھی مغربی مفکرین تھے فرض کیجئے وہ LIBENITZ کو لیتے ہیں Atomism کا ذکر تے ہیں..... تو ان کا تقابل کر کے ثابت کرتے ہیں کہ ساری چیزیں وہی ہیں جو پہلے ہم نے سوچی تھیں اور آپ اگر فلسفے میں Principle of doubt لائے ہیں تو وہ غزالی کے ہاں، ہمارے ہاں، پہلے ہی موجود ہے۔ کون سی نئی چیز آپ نے پیدا کردی ہے؟ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میں نے کہا ہے کہ We should not have appologetic attitude ہم اپنے کردار کے ذریعہ سے کارگزرای اپنی دکھائیں تو اس حساب سے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہم نے ابھی تک Achieve کیا ہے "میں یہ نہیں کہتا کہ ہم نے کچھ achieve نہیں کیا ہے سب سے بڑی بات جو ہم نے achieve کی ہے وہ پاکستان کی creation ہے"۔ We are a nuclear power۔ یہ بھی بڑی Achievement ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ٹھیک کیا ہے۔ خال خال ایسی شخصیات پاکستان بننے کے بعد پیدا کی ہیں مثلاً ہمارے Nucler Science کے استاد ڈاکٹر عبدالقدیر پھر اس کے علاوہ اور شخصیات حکیم سعید یا پھر ایسی شخصیات جیسے عبدالستار ایدھی وغیرہ۔ یہ لالہ صحرا کی طرح پیدا ہوتے رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پاکستان بن چکنے کے بعد ہم نے ایسی شخصیات پیدا نہیں کیں جو بڑی Eminen ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم سیاست اور دوسرے مسائل کو حل نہیں کر سکے۔ Apparently میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہی ہے کہ حضرت علامہ کا یہ کمال ہے کہ ہم نے یہ ملک حاصل کیا اور ہمیں اس ملک میں قائداعظم جیسی شخصیت نے جو اصول دیئے گو ہم ابھی تک اس پر قائم نہیں رہے یا اس سے ہٹ گئے ہیں۔ (علامہ اقبال کے اصولوں سے بھی اور قائداعظم کے اصولوں سے بھی) لیکن جہاں تک انہوں نے جو چیز ہمیں دی ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ اس وجہ سے میں نہیں کہتا کہ ان کی Achieventmt نہیں ہوئی۔

دوسرا جو آپ کا سوال ہے ابھی تک تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے یہاں پر ایسی کوئی کارروائی کی

ہے۔ایسی قانون سازی کی ہے جس سے وہ مقاصد حاصل ہو سکے ہوں جو حضرت علامہ کی نگاہ میں تھے۔آپ نے خود اپنی کتاب میں یہ بحث کی ہوئی ہے کہ حضرت علامہ نے جن خیالات کا اظہار حدود و آرڈیننس کے متعلق کیا ہے۔ان قوانین کے متعلق، قرآنی احکام کے متعلق جن میں Penalty ہے ان کا استدلال شاہ ولی اللہ پر Base نہیں کرتا شاید وہ شبلی پر Base کر سکتا ہو کیونکہ شاہ ولی اللہ Conservative school کے حامی تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے تو ان کی شخصیت بہت اہم ہے لیکن میں حضرت علامہ شبلی کو بھی کم شخصیت نہیں سمجھتا۔اگر شبلی نے بھی یہ کہہ دیا کہ بعض وقت جب نبی کسی قوم پر مبعوث ہوتا ہے تو اس قوم کے خصائل، عادات اور رسم و رواج کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس طرح کی وحی نازل ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس وحی کا اطلاق بعد کی آنے والی نسلوں پر کیا جائے۔تو یہ ایک بڑا ہی دلچسپ نکتہ ہے کہ ایک جدید ذہن، آج کا جدید مسلمان کا ذہن Immediately اس کو Respond کرے گا۔اب یہ دیکھئے کیا خدا کی زبان عربی تھی؟ کیونکہ مبعوث نبی کو کیا جانا تھا ایسی قوم میں جو عربی زبان جانتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کا ترجمہ اردو میں نہ کر سکیں۔میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق مطلق اجتہاد کی ضرورت ہے۔

زاہد منیر عامر: جی علامہ نے روحانی معاشرے کی تشکیل کی بات کی اور فرد کے روحانی استخلاص اور ایک ایسے سماج کی نشو ونما جس کی اساس روحانیت پر ہو۔روحانی علوم سے دلچسپی رکھنے والی شخصیت ہمارے عہد کے معتبر اور منفرد شاعر، دانشور، مصنف جناب شہزاد احمد ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے The reconstruction of Religious Thought in Islam کو اردو میں اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے عنوان سے منتقل کیا ہے۔

شہزاد احمد: جاوید اقبال صاحب! مجھے ایک بات کی بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے لیکچر کو ایک ایسے نکتے پہ ختم کیا ہے جہاں سے ایک نیا آغاز ہو سکتا ہے۔آپ نے یہ کہا کہ صرف علامہ اقبال تک ہم اپنے آپ کو محدود نہیں رکھ سکتے۔ہمیں اس سے آگے چلنا چاہئے۔کیونکہ اقبال کی اپنی روایت بھی یہ تھی کہ جہاں سے ان کو نظریات کا Thread ملا تھا اس کے بعد انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ لیکن یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ علامہ اقبال کے گرد جو حلقہ تھا اس میں سیاسی لوگ بھی تھے اور مذہبی اور بھی بہت سے لوگ تھے۔اور ان کی شخصیت کے جو مختلف پہلو ہیں ان پر کام کیا گیا۔ان کو

Develope کیا گیا تو آپ نے خود تسلیم کیا کہ لیکچرز کو وہ اہمیت نہیں ملی جو ملنی چاہئے تھی شاید ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فکر جو ہے اس سے چیزیں تبدیل نہیں ہوتیں حالانکہ انسان آئیڈیا پیدا نہیں کرتا آئیڈیا انسان کو پیدا کرتا ہے۔

جاوید اقبال: بالکل درست ہے۔

شہزاد احمد: اگر ہم اپنے آئیڈیاز میں وہیں ہیں جہاں ہم پہلے تھے تو پھر تو صورت حال بہت مشکل ہو جائے گی۔ اقبال نے عملی طور پر اپنے لیکچرز میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو Contemporary لوگ تھے جن کے نظریات تھے ان میں بعض ایسے لوگ ہیں جو بعد میں مشہور ہوئے لیکن علامہ تک ان کے نظریات پہنچ چکے تھے مثلاً اوسپنکیز جو اس زمانے میں بہت اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ دراصل علامہ بہت زیادہ اپ ٹو ڈیٹ تھے۔ ایک تو سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ کہ ہم اپنی اس علمی سطح کو بلند کر سکیں اور ان سوالوں کو پھر سے اٹھا سکیں جو سوال علامہ نے اٹھائے تھے اور وہ درمیان میں رہ گئے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کے بعد بھی صورتحال بہت زیادہ تبدیل ہوئی ہے مثلاً بہت سی گفتگو علامہ کے لیکچرز میں ٹائم کے بارے میں ہے۔ Absolute time پر انہوں نے بہت زور دیا ہے۔ اب صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ Meta Physics اور Physics ایک ہی چیز ہو گئے ہیں ۔آپ دیکھ سکتے ہیں کہ انہوں نے آئن اسٹائن کے نظریات کا ذکر کیا ہے لیکن اس کو قبول نہیں کیا۔

اگر ہم اب بھی Absolute time کے پیچھے لگے رہے تو Relativity کے حساب سے جو ساری ترقی ہے وہ Fourth dimension کے حوالے سے ہوگی۔ اس میں تو ہم پیچھے رہ جائیں گے پھر Space کی جتنی Develpoment ہونی ہے اس میں بھی ہماری کوئی شراکت نہیں ہو سکے گی تو یہ جو ٹائم کا Concepted self ہے اس کو بھی تبدیل کرنے کی میرے خیال میں ضرورت ہے اور علامہ نے تو اس کے بہت سے پہلو بیان کئے۔ لاتسبو الدہر تک کہہ دیا یعنی Dont nullify time, time is god

ڈاکٹر جاوید اقبال: Time کے متعلق میں صرف یہی وضاحت کر سکتا ہوں کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کیونکہ میرا بھی جہاں تک علامہ کے خیالات یا افکار سے تعلق ہے وہ آپ کی طرح کسبی ہے، مجھے علامہ نے کوئی اپنی طرف سے ہدایت نہیں کر رکھی ہے کہ ان کے خیالات یا افکار کے معنی ان کے یہ

تھے مگر حقیقت میں جہاں تک مسئلہ زماں کا تعلق ہے ان کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ٹائم کا جو مسئلہ ہے اس کو سمجھنا مسلمانوں کیلئے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ اچھا اب زندگی موت کا مسئلہ کیونکر ہو گیا؟ اس کی Interpretation میری نگاہ میں یہی ہے کہ حضرتؒ علامہ کے خیال میں یہ تھا کہ اگر مسلمان صرف Serial time میں Believe کرتا ہے کہ صبح اٹھے روٹی کھائے دفتر چلے گئے پھر واپس آئے رات کی روٹی کھائی سو گئے، پھر اٹھے، سو گئے تو یہ تو نباتات یا حیوانات کی زندگی ہے تو Creativity اور Innovation کیلئے نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ Durational Time کی ضرورت ہے اور مسلم معاشرے کو اسی کا احساس وہ دلانا چاہتے تھے کہ خدا کا واسطہ ہے آپ ذرا فکر کرو وقت کو سمجھنے کی کوشش کرو، اس کے دو پہلو ہیں ایک Durational Time ہے جو کہ آپ کے ذہن میں ہے Subjective اور دوسرا Serial Time ہے Dont go after serial time, try to attach importance to the time which is subjective, which is with in you اور اس کے تحت ہی creativity ہوتی ہے اور Solitiude میں جو Creativity اور Innovation ہے اس کی طرف آپ کو راغب کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حیات بعد موت آپ حاصل نہیں کر سکتے ہیں اس کو وہ حاصل کر سکتا ہے جو Creative ہو تبھی خدا کا ہم کار بن سکتا ہے۔ تو یہ سارا Emphasis یہی ہے کہ وہ اپنی community کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کو کہتے تھے کہ اگر تم Creative کچھ گناہ ہی کر دو تو وہ بھی ثواب میں منتقل ہو جاتا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے Creative تو بنو۔

تو اب اس حساب سے اگر آپ دیکھیں تو وقت کی جو اہمیت تھی اس کا احساس ٹھیک ہے ان کو تھا لیکن جہاں تک ان کا Emphasis ہے Serial Time پر نہیں بلکہ Durational time پر ہے۔ کبھی وہ برگساں کو اپنی Support میں لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو مسلم فلاسفہ ہو گزرے ہیں جنہوں نے اس وقت اس مسئلہ پر بحث کی ہے ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا جو اپنا نظریہ تھا جو دل کی چھپی ہوئی بات تھی وہ یہی تھی کہ کسی نہ کسی طریقہ سے مسلمانوں کو Creative کرو۔ یہ تو حیوانوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ہم بجائے خود اب بھی More or less حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے صرف روزی کمانی ہے اور روٹی

کھانی ہے سو جانا ہے جاگ پڑنا ہے، سو جانا ہے، جاگ پڑنا ہے تو پھر اس طرح تو مقصد حل نہیں ہوتا جب تک کہ We are not creative and contribute something to the betterment of mankind.

زاہد منیر عامر: یہی بات انہوں نے شعر میں کہی کہ

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہا است
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

کہ انسان کا امتیاز اور اس کی بقا اسی میں ہے کہ وہ ایک تخلیقی وجود رکھتا ہے ورنہ چاند اور ستاروں کی طرح زندگی گزارنے میں کوئی نیا پن نہیں چاند ستارے وہی کچھ کرتے ہیں جو پہلے سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

ناظرین ڈاکٹر وحید عشرت صاحب نے Reconstrucion کا نیا ترجمہ ''تجدید فکریات اسلام'' کے نام سے کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت صاحب بھی آج کی اس محفل میں شریک ہیں۔

وحید عشرت: اقبال نے دیباچہ میں فرمایا ہے کہ نئے لوگ بہتر نظریات پیش کریں گے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اقبال پر ایک انتقادی اور تنقیدی نظر ڈال کر ان چیزوں سے بچتے ہوئے ایک ایسا نیا سوچ بنائیں جس میں اصول اولیہ مغرب کے اصول اور سائنس نہ ہوں اور اس سے ہم خوشہ چینی کرتے ہوئے اسلامی معتقدات کی تعبیر نہ کریں بلکہ قرآن کے اصول اولیہ کی بنیاد پر ہم خود ان کو Evaluate کریں اور ان کا تجزیہ کریں کہ وہ کہاں Stand کرتی ہیں۔

جاوید اقبال: زیادہ تبصرہ تو نہیں کرسکتا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ علامہ نے بنیادی طور پر مغربی Thinking کی خوشہ چینی نہیں کی۔ انہوں نے یہی کوشش کی ہے کہ ظاہر کیا جائے کہ ہمارے مفکرین جو کچھ بھی سوچتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے ابھی آپ کو ڈیکارٹس کی مثال دی تھی کہ جس وقت انہوں نے یہ کہا کہ اس کا Doubt کا Method الغزالی کے ہاں ملتا ہے تو انہوں نے یہ موازنہ کرکے دکھانے کی کوشش کی کہ ہماری جو Thinking ہے وہ اسی طرح ہے جس نتیجے پر اب تم پہنچے ہو۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ نے ہمیں ایک طرح سے

Provoke کیا ہے۔

زاہد منیر عامر: جی شکریہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب۔

ناظرین کرام! علامہ اقبال نے اپنے افکار کو دو حرف قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ ان میں سے ایک کی اصل ذکر ہے اور ایک کی اصل فکر ہے۔ اور اپنے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ

ای تو بادا وارثِ این ذکر و فکر

اور تجھے اس ذکر اور فکر دونوں کا وارث ہونا ہے۔ عقل اور روح کے امتزاج سے زندگی کی تشکیل نو کرنی ہے اور علامہ نے جو بات خطبات کے دیباچے میں فرمائی کہ فکر کی دنیا میں قطعیت کوئی چیز نہیں ہوتی وہ ہمارے لئے اس راستے کو آسان بناتی ہے کہ ہم تشکیل جدید الھیات اسلامیہ میں اٹھائے گئے سوالات کے جواب کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھیں اور علامہ سوال کے جس مقام پر کھڑے ہیں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

☆☆☆

مرتب: ڈاکٹر بدرالدین بٹ

اقبال اور عظمت آدم

کشمیر یونیورسٹی میں دوروزہ قومی سمینار.....ایک رپورٹ

کشمیر یونیورسٹی بجا طور پر جس تحقیقی ادارے پر ناز کرسکتی ہے وہ بلا شبہ اس کا اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی ہے۔ یہ ادارہ جس سنجیدگی اور سرگرمی کے ساتھ اپنے سال آغاز یعنی ۱۹۷۷ء سے ہی میدان تحقیق وتدریس اور تصنیف میں جو کارنامے انجام دے رہا ہے وہ یقیناً قابل صد افتخار ہیں۔ اس ادارے سے اب تک اسی (۸۰) سے زیادہ اسکالروں کو ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جاچکی ہیں اور اسی تعداد میں اردو، انگریزی، ہندی اور کشمیری مطبوعات بھی شائع کی گئی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا اعلیٰ معیار کا ایک تحقیقی مجلہ اقبالیات بھی چھپتا ہے جس کے اب تک اکیس شمارے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں جسمیں مُلک اور بیرون ملک کے ماہرین اقبالیات اور اساتذہ ادب کے مقالات شامل ہوتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال اقبال کے یوم ولادت اور روز وفات کے موقعے پر توسیعی خطبات، مشاعروں اور سمیناروں کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ اقبالیات سے متعلق مختلف مسائل، موضوعات اور عنوانات پر ماہرین اقبالیات اور زبان وادب کے اساتذہ و محققین کو اظہار خیال کا موقع فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائریکٹر مرحوم پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد امین اندرابی مرحوم اور پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کے ادوار نظامت میں نامساعد حالات کے باوجود تسلسل کے ساتھ سمیناروں توسیعی خطبات، مشاعروں اور بیت بازی کے مقابلوں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ ایک سنجیدہ فکر ماہر اقبالیات ہیں اور اقبالیات میں پہلی خاتون پروفیسر ہونے کی حیثیت سے انہیں ایک انفرادی اور امتیازی مقام و حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی سربراہی میں اقبال کے ۱۳۵ویں یوم ولادت کے موقعے پر ۹۔۱۰ نومبر ۲۰۱۲ء کو ایک دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں ہوا۔ جس کا آغاز جناب شہنواز شاہ کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا اور معاً بعد زُبیر سلفی نے کلام اقبال سُنا کر سامعین

کومحظوظ کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد صاحب نے فرمائی۔ ایون صدارت میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر عبدالغنی مدہوش سابق صدر شعبہ ایجوکیشن کشمیر یونیورسٹی، جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی اور پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ، تشریف فرما تھے۔ اس سمینار میں، علماء دانشور، عمایدین شہر، ادباء، شعراء محققین، ومصنفین کے علاوہ عاشقان اقبال کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اپنے افتتاحی کلمات میں انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ نے فرمایا کہ اقبال نے اپنے دور کی غیر انسانی عالمی صورت حالات کے پیش نظر نہایت بلند آہنگی کے ساتھ انسان کی گہری معنویت اور اسکی عظمت کا اعلان کیا۔ انہوں نے جس پُر جلال وپُر جمال اسلوب میں انسان کی غایت تخلیق اور اس کے شرف کا تذکرہ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ انہوں نے قرآن کے تتبع میں عظمت آدم کے تصور کا احیاء کیا۔

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب نے اپنے کلیدی خطبے ''اقبال اور عظمت آدم'' میں فرمایا کہ اقبال کی فکری وتصوراتی کائنات کا مرکزی حوالہ صحیح معنوں میں انسان ہی ہے بقیہ ان کے دیگر تصورات خودی، عشق اور زماں ومکان وغیرہ اسی بُنیادی محور کے تابع رہ کر اپنا کوئی مفہوم، جواز یا معنویت حاصل کر پاتے ہیں انہوں نے مزید کہا کہ جسقدر تسلسل اور ارتکاز کے ساتھ اس کا اہتمام اقبال کی شاعری میں آتا ہے اس سے تکریم آدم کا ایک نیا تصور سامنے آتا ہے۔

اقبال کی شاعری جو اخلاقی اور روحانی اقدار کا بیش بہا خزینہ ہے اور انسان جو اس شعری کا ئنات کی شناخت کا بنیادی وسیلہ ہے اس کے برگزیدہ نقوش اس تخئیلی کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں مُرتعش نظر آتے ہیں۔ اُسے نہ صرف اپنی عظمت کا گہرا شعور واحساس ہے بلکہ وہ خالق کائنات کے بالمقابل خودکو بھی ایک فعال اور معنی خیز تخلیقی قوت تصور کرتا ہے۔

جناب بشیر کرمانی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کے تخلیقی مقصد پر تبصرہ کرتے ہوئے عظمت آدم کے تعلق سے اقبال کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں اپنانے کی تلقین کی۔

اس تقریب کے صدر نشین، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر طلعت احمد صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ گاندھی بھون میں طلبہ اور دیگر شایقین کی کثیر تعداد میں موجودگی اس بات کی عکاس ہے کہ کشمیری طلبہ کو اقبال سے انتہائی دلچسپی اور لگاؤ ہے اس لئے اقبال اسٹڈیز کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے لئے کوئی غفلت نہیں برتی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ

اقبال اسٹیڈیز پر خصوصی فیلوشپ شروع کی جائے گی جبکہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے ایک خصوصی ایڈوائزری بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔انہوں نے اعلان کیا کہ ادارے کو عنقریب نئی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل کردیا جائے گا۔ جہاں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہونگی۔اس موقع پر پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ کی تصنیف'' اقبال اور اقبالیات .....ایک منظر نامہ'' اور ان کی مرتب کردہ کتاب ''فکر وفن اقبال کے چند پہلو'' اور اقبالیات کا شمارہ نمبر ۲۱ کی رسم رُونمائی بھی انجام دی گئی۔

اس سمینار کی دوسری نشست دن کے ڈھائی بجے شروع ہوئی جسکی صدارت ریاست کے ممتاز ادیب' نقاد اور محقق جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب نے کی۔اس نشست میں پروفیسر عبدالغنی مدہوش پروفیسر نور احمد بابا' پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی پروفیسر بشیر احمد نحوی' پروفیسر تسکینہ فاضل اور ڈاکٹر فرحت احساس نے اپنے مقالات سے سامعین کے فکر ونظر کو منور کیا۔

ریاست کے معروف ماہر تعلیم پروفیسر عبدالغنی مدہوش صاحب نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا جسمیں انہوں نے عصر حاضر میں فکر اقبال کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

" iqbal's thought provides a strong key to unlock most important treasures of knowledge. The key is systemtic understanding of research into factors responsible or the growth or decline of the civilizations' looking into elements which never lose their importance either in time or context

انہوں نے مزید بتایا کہ اقبال بدلتے ہوئے عالمی حالات سے آگاہ تھے۔اسی لئے انہوں نے ایک متوازن سماجی' ثقافتی اور اقتصادی پروگرام وضع کرنے کی تلقین کی۔تاہم ایسا کرتے ہوئے ہمیں اپنے مذہب سے دوری یا انحراف نہیں کرنا چاہئے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر اور ریاست کے معروف ماہر اقبالیات اور عاشق اقبال پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب نے اپنے مقالہ میں فرمایا کہ انسان کی ذات فکر اقبال کا وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد اُن کے جملہ افکار گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے نظام فکر میں ایک حقیقی اور صحیح انسان کی وہی تصویر ہے جو انہوں نے اپنے شاندار ملی تاریخ کے حسین اوراق میں دیکھی تھی۔اقبال انسان کی عظمت' اسکی تخلیقی صلاحیت' اسکی بے پناہ وسعت' اس کے

نائب الہیٰ ہونے کی اہلیت اوراسکی ستاروں کی گذرگاہوں سے چلنے کی طاقت کا قائل ہے۔لیکن پورے کلام اقبال میں موجودہ عہد کا انسان اپنی تمام انسانی قدروں کو روند کرآدم دری اورسودا گری کا مجموعہ بن کررہ گیا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کی موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ اپنے مقالے میں اقبال کی اہم نظم ''فرشتے آدم کو جنت سے رُخصت کرتے ہیں'' کا مطالعہ پیش کیا۔اپنے مبسوط مقالے میں پروفیسر محترمہ نے فرمایا کہ بال جبرئیل کی یہ نظم عظمت آدم کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اس نظم کے مطالعے سے اُن تمام منفی تصورات کا ابطال ہوتا ہے جن کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے ازلی گناہ کی پاداش میں اس عالم ارضی پر بھیجا گیا ہے اوراُسے کرۂ ارض پر بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔آپ نے مزید کہا کہ اگر بغور دیکھیں تو اگر آدم وحوا اس عالم ارضی پر نہ اُترتے تو آدم کے اندر وسیع امکانات کس طرح بروئے کار آتے۔اپنے مقالہ کے آخر میں محترمہ پروفیسر صاحبہ نے فرمایا کہ دراصل علامہ اقبال عظمت آدم کے ھُدی خواں ہیں۔انہوں نے اپنی تمام تر عمر انسان کو خود بین' خُدا بین اور جہاں بین بنانے کے لئے وقف کی۔اُن کا فلسفۂ خودی انسان کو اسکی انسانیت کی معراج پر پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔

اس نشست میں شعبہ سیاسیات کے پروفیسر نوراحمد باباصاحب نے Man and his place in iqbal کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا۔ "there is a running theme in his poetry whereby theme in his poetry whereby he critiques exploitative social relationships that undermine human dignity and makes substantial sections of human society suffer socio- economic disadvantage'that is why iqbal characterizes the capitalist expolitative systems as develish. By implication the vital attribute of a divine or Non Satanic order has to be social and economic justice.

شاہ ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی نے اپنے مقالے کی تلخیص پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال نے عظمت آدم کے بارے میں کچھ بنیادی نکتے اٹھائے ہیں اوراس موضوع کو فلسفہ' تصوف اور مذہب کے تناظر میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔انھوں نے کہا کہ وحدت الوجود کے بارے میں جو تنقید علامہ اقبال نے

اسرار خودی میں پیش کی تھی' اُس کے پیچھے بھی دراصل انسان کی خودی کا انکاراورانسان کی انفرادیت کی نفی مضمر تھی جبکہ اقبال انسان کو باقاعدہ ایک انفرادیت کا حامل جوہر تخلیق مانتے ہیں۔ پروفیسر رفیع آبادی صاحب نے اپنے مقالے میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی کہ علامہ نے قضاً وقدر کے سلسلے میں بھی انسان کی قدرت واستطاعت پر مبنی نظریہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید بٹ نے ''اقبال کے تصور خودی ..... چند بنیادی پہلوؤں کا ایک تجزیہ'' کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ پڑھا۔آپ نے مسلم متکلمانہ ومتصوفانہ افکاراور جدید مغربی فلسفے کے تناظر میں اقبال کے تصور خودی کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اقبال اپنے نظریہ خودی کو قرآنی تعلیمات' عرفان نفس اورانسان کو عطا کردہ خصوصی منصب (خلافت الہیہ) سے اخذ کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک مغربی تصورات انسان کی ساری تگ ودو عقلیت اور مادیت rationallism (and materialism) تک محدود کرتے ہیں جبکہ اسکی صحیح روحانی اور مادی میلان Unity میں پوشیدہ ہے۔اقبال اسکو خودی اور بے خودی کے اسرار ورُموز قرار دیتے ہیں۔مقالہ نگار نے جدید مغربی مفکرین خصوصاً ہیوم Hume ڈیکارٹ Descarteاورولیم جیمز William james کے نظریات کا حوالہ دیتے ہوئے اقبالی نظریہ کو متوازن اورامتیازی قرار دیا کیونکہ اقبال خودی کو انسانی زندگی کے اصلی جوہر کے طور پر پیش کرتے ہیں جو دونوں غیر مادی اور Spiritual and materialمنازل طے کر کے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہوتا ہے۔یہ حیات انسانی میں ہی ایک خاص قسم کے ارتقاء کا موجب بنتا ہے اوراسکے نتائج اعمال کی نوعیت (خیروشر) پر منحصر ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز کے ڈاکٹر فرحت احساس نے اپنے مقالہ ''توشب آفریدی' چراغ آفریدم: اقبال کا مابعدالطبعیاتی انقلاب'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے اپنے زمانے میں نظریاتی جبرو استبداو' اقتصادی استحصال اورسیاسی کشت وخون سے ڈرے' سہمے' ناکس وناچار اورمظلوم ومقہورانسانوں کو آزادی اورانسانی خودمختاری کا ایسا نسخہ کیمیا عطا کیا جس نے ان انسانوں کے بجھے ہوئے شعلہ وجود کو بھڑکا کرانہیں اپنے ایجاب استحکام کے ایک نئے سفر پر روانہ کیا لیکن روحانی انتظام اور جمالیاتی انتباہ کے ساتھ کہ ظلم زدہ لوگ اپنے اوپر کیے گئے مظالم کی یاداوراپنے اذیت زدہ حافظے کے بہکاوے میں آکر ایک نئے ظلم وتشدد کے موجد نہ بن جائیں بلکہ جہاں بانی اورانسان سازی کے ایک عالمگیر منصوبے کا ہراول دستہ بنیں اورانسانوں میں سے ایک ''خیرامت

'' کے اٹھائے جانے کے آفاقی مژدۂ تعمیر کو بروے کار لائیں۔

سمینار کی تیسری نشست ۱۰ نومبر ۲۰۱۲ کو صبح گیارہ بجے جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جسمیں جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر محمد شاہد حسین نے پہلا مقالہ بعنوان '' علامہ اقبال کا مسلک انسانیت .....احترام آدم'' پیش کیا پروفیسر صاحب نے اپنے مقالے میں ہیومنزم (Humanism) کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد کہا کہ اسمیں شبہ نہیں کہ اقبال نے انسان دوستی کا جو فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے اسمیں انہوں نے مشرق ومغرب کے متعدد مفکرین سے اثر قبول کیا ہے اور اپنے ہمعصروں کو متاثر بھی کیا ہے مگر ان کا عظمت بشر کا بنیادی نظریہ اسلام سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ علامہ اقبال نے گوناگوں انسانی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے انسان کے تمام درد کا درمان پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک درد مزدور اور دبے کچلے انسانوں کا ہے۔ اسلام میں سماجی مساوات' رنگ ونسل کی بناء پر تفریق نہ کرنا عدل وانصاف پر زور' رزق حلال کی تلقین' منصفانہ معاشی نظام' سرمایہ داری کی مخالفت' ذخیرہ اندوزی سے نفرت' انسانی فلاح وبہبود کی یہ تمام چیزیں عظمت آدم کے اعتراف میں ہیں۔ علامہ اقبال نے احترام آدم کے تصور کو انہی اسلامی انوار سے منور کیا ہے۔

پروفیسر شاہد حسین کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ڈاکٹر شاد حسین اندرابی نے ' طواسین اقبال .....ایک مطالعہ فکری جہات اور فنی تخلیقیت'' کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ طواسین اقبال میں ڈراما کے پلاٹ کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے اور شاعرانہ خیال آفرینی اور اسکی جذباتیت بھی یوں ڈرامائی پلاٹ اور شعری خیال آفرینی دونوں ہی تخیل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے طواسین میں تخیل اپنے عروج پر فائز ہے۔ یہاں استعارے اور تلمیحات شبستان میں روشن تاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔

جامعیہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے ڈاکٹر خالد جاوید نے '' اقبال کی ایک غزل کا تجزیہ .....عظمت آدم اور وجودیت کے حوالے سے'' اپنا مقالہ پیش کیا جسمیں انہوں نے اقبال کی ایک مشہو غزل (ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں) کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی عظمت اور وجودی طرزِ فکر کی نمایندگی کرنے والی اس غزل میں اقبال کی شاعری اور ان کا فلسفہ آپس میں گھل مل کر ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غزل میں یہ کرشمہ آسان نہیں ہے۔ نظم جو کہ ارتقائے خیال کی حامل ہوتی ہے وہاں تو یہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مگر غزل کے فارم میں اپنے فلسفے کو

اسطرح سیال کردینا کہ ہمارے سامنے خالص اوراعلیٰ ترین شاعری کی مثال سامنے آجائے' یہ کسی معجزے سے کم نہیں اور یہ معجزہ صرف اقبال ہی کرسکتے تھے انہوں نے مزید کہا کہ اقبال کی زیر مطالعہ غزل اپنے اندر آفاقی صداقت کے امکان رکھتی ہے اور یہ صداقت اقبال کے اپنے تخلیقی تجربے کے باعث ہمیں اپنا جلوۂ حق دکھادیتی ہے۔اس تخلیقی تجربے کا ساتھ اقبال کی مخصوص شعری زبان نے دیا ہے ورنہ محض تصورات کے ذریعے کوئی بھی فلسفہ ہماری روح تک اُتر جانے میں ناکام رہتا ہے۔

سمینار کی چوتھی اورآخری نشست پروفیسر مرغوب بانہالی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔جسمیں پہلا مقالہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ سوشل ورک کے سربراہ ڈاکٹر پیرزادہ محمد امین نے بعنوان " Dr ' sir Muhammad Iqbal : The progressive and the Reactionary. پیش کیا انہوں نے کہا "Allama Iqbal (RA) Was the ambassador of humanity, whose poetry touched social evils and unlike all poets of the World,he used his poetry for the moral uplifment of the society.Iqbal's poetry will always remain interesting.Today,whenthe entropy in world social order is touching the sky ,the need for his moral prescriptions and adovacates is being felt.His whole thought carreis a great relevance in the contemporary His message is universal i.e the message of love for world. the humanity"

جامعہ ملیہ کے شعبۂ سوشیالوجی کے ریسرچ اسکالر جناب ادفر رشید شاہ اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی' سرینگر کے جناب عامر سہیل وانی نے اپنے مشترکہ انگریزی مقالے میں اقبال کے فلسفۂ خودی پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے کہا

"This philosophy aims at introducing man to his real self and to earth. Allama'sphillosophy is in the right an unbeaten attempt to synthesize a social set up whose

foundations are strictly moral and spiritual as opposed to mere binding of social interdependence. Man is central to his philosophy as allama deems man as the crown of creation".

اقبال انسیٹی ٹیٹ کے ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے اپنے مقالے میں کہا کہ اقبال نے جہاں مسلمانوں کو عصری تقاضوں کے لئے بیدار کیا وہیں انہیں خصوصیت کے ساتھ قرآنی شعور سے بہرہ مند ہونے کی تعلیم دی۔ وہ عصر حاصر کے خوفناک آدم کشی کے طوفانوں میں صرف اسلام کو تمام انسانیت کا نجات دہندہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اسلامی نظام حیات تین اصولوں پر استوار ہے۔ پہلا اصول اتحاد انسانیت ہے' دوسرا انسانی مساوات اور تیسرا اصول حریت فکر و عمل ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صاحب نے مزید کہا کہ اقبال نے اپنی تمام ادبی اور علمی صلاحیتوں کو انسانیت کی سربلندی کی خاطر وقف کیا تھا۔ ان کا یہ شعر انہی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مقام آدمی

اس دوروزہ قومی سمینار کی یہ خصوصیت رہی کہ ہر نشست میں پڑھے گئے مقالات پر کھل کر بحث ہوئی جس سے مطالعات اقبال کے نئے نئے گوشے سامنے آگئے۔

ان نشستوں کے صدر صاحبان جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب جناب بشیر احمد کرمانی صاحب اور پروفیسر مرغوب بانہالی صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں اپنے ذریں' علمی تبحر اور تحقیقی استعداد کا وافر ثبوت فراہم کردیا۔ انہوں نے کہا کہ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کر کے فکر اقبال کے نئے گوشے سامنے لائے ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور جن سے ہمارے عصر میں دانشور اقبال کی معنویت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ امید کی جانی چاہے کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ ان راہنمایانہ خطوط کی روشنی میں مستقبل میں اپنا سفر جاری رکھے گا۔

جوان سال اور صالح فکر دوست جناب ڈاکٹر معید الظفر خصوصی تذکرہ کے اس لئے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس سمینار کی نظامت بطرز احسن انجام دی۔

☆☆☆

اقبال اکیڈمی
خبرنامہ

توسیعی تقریر بعنوان ''مسلم دنیا کا تعلیمی بحران اور اقبال کا فلسفہ تعلیم''

مقرر : پروفیسر زینت کوثر صاحبہ (ملائیشیا اسلامی یونیورسٹی)

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیر انتظام ''مسلم دنیا کا تعلیمی بحران اور اقبال کا فلسفہ تعلیم'' زیر عنوان زینت کوثر پروفیسر اسلامک یونیورسٹی ملیشیاء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر انور معظم سابق صدر شعبہ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی نے کی پروفیسر احمد اللہ خاں سابق ڈین فیکلٹی لا عثمانیہ یونیورسٹی اور محمد عبدالرحیم قریشی کل ہند مجلس تعمیر ملت نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈمی کی قرات کلام پاک سے ہوا اور انہوں نے مہمانوں اور سامعین کا استقبال کیا اور مہمان مقرر کا مختصر تعارف کرایا۔ معروف شاعر اور دانشور ڈاکٹر یوسف اعظمی نے زینت کوثر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ محترمہ نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور آج کل خواتین کے مسائل پر کام کر رہی ہیں۔ سید امتیاز الدین نے ابتداء میں کلام اقبال پیش کیا۔ زینت کوثر نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج کل تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ہے افسوس ہے کہ مسلم معاشرہ اسلامی تعلیمات کا نمونہ بننے میں ناکام ہے۔ برائیاں پھیل رہی ہیں۔ ہم ہر محاذ پر ناکام ہو رہے ہیں۔ ہم نے علم کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اٹھارویں صدی میں مغرب میں تعلیم کو انسانی ضروریات کا تابع کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالی نے انسان کو ہدایت قرآن اور سنت کی اتباع میں رکھا ہے۔ مغربی سائنسدانوں اور مفکرین نے محض عصری ضروریات کی تکمیل سے تمام انسانی ضروریات کا حل تلاش کرنے کا دعوی کیا تھا۔ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہی ہمارا مقصد تعلیم ہونا چاہئے۔ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی بنیاد پر فلسفہ تعلیم کی تشریح کی ہے۔ علم کا مقصد صرف معاشی مسائل کو حل کرنا نہیں ہے۔ اقبال نے آداب خود آگاہی کو اہمیت دی ہے۔ اس جلسہ میں محمد عبدالرحیم قریشی نے اقبال اکیڈمی کے ششماہی ترجمان اقبال ریویو کے تازہ

شمارے کی رسم اجراء انجام دی۔ انہوں نے کہا کہ آج طریقہ تعلیم انسان کو بے اختیاری کی طرف لے جارہا ہے۔ قرآن میں علم کے ذکر کے ساتھ ہدایت کا بھی ذکر ہے۔ آج ہمارے طریقہ تعلیم کا ایک تنقیدی جائزہ ہونا چاہئے۔ پروفیسر احمد اللہ خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اتفاق کیا کہ علم کا مقصد صرف کسب معاش نہیں ہے۔ ہماری سوسائٹی کے انحطاط کی علامت ہے کہ بعض برائیوں کو بھی اچھا سمجھا جانے لگا ہے۔ عبدالمقیت نے اپنے تاثرات میں کہا کہ انسان کو خدا شناس ہونا چاہئے۔ اگر چہ کہ کسب معاش بھی ضروری ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر انور معظم نے اپنے تاثرات میں کہا کہ انسان کو خدا شناس ہونا چاہئے اقبال کی شاعری سے زیادہ ان کی نثری مضامین کے مطالعے سے ہم ان کے فلسفہ تعلیم کو سمجھ سکتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اقبال کے ایک مضمون ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کی طرف سامعین کی توجہ دلائی جو 1911 میں شائع ہوا تھا۔ ہمارے نصاب تعلیم پر بھی وقتاً فوقتاً توجہ دینی چاہئے۔ آخر میں محمد ضیاء الدین نیر کے شکریہ پر محفل برخاست ہوئی۔

مذاکرہ بعنوان ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ''

اظہار خیال (ا) ڈاکٹر مظفر فاروقی (امریکہ)

(ب) جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر تعمیر ملت

(ج) جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈمی

ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اگر آج کے دور میں بعض حلقوں کی جانب سے انہیں نظر انداز کرنے کی دانستہ کوشش کی جاری ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم تاریخ کی روشنی میں اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو واضح انداز میں پیش کریں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مظفر فاروقی نے اپنی تقریر میں کیا۔ ڈاکٹر فاروقی اسلامک ہیریٹیج فاونڈیشن کے زیر اہتمام گلشن خلیل مانصاحب ٹینک میں منعقدہ توسیعی لکچر میں خطاب کررہے تھے۔ اس نشست کی صدارت مولوی عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت نے کی۔ قرات کلام پاک کے بعد سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈمی نے کلام اقبال پیش کیا۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی سائنس کے اسکالر ہیں اور انہوں نے بلیک ہول تھیوری پر بھی کام کیا ہے۔ مسلم دور حکومت پر انہوں نے بہت اچھی کتاب لکھی

ہے۔امریکہ میں انہوں نے کئی مشاعروں کا اہتمام کیا ہے۔ضیاءالدین نیر کارگزار اقبال اکیڈمی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی ۔ ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر چہ عرصہ دراز سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں لیکن ان کا خلمی تعلق اپنے وطن سے برقرار ہے،اس ملک میں مسلمانوں کی جڑیں گہری ہیں۔سر ولیم مور نے جب ایک گمراہ کن کتاب لکھی تو اس کا جواب لکھنے کے لئے سرسید احمد خان اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان گئے اور وہاں بیٹھ کر مدلل جواب کتابی صورت میں لکھی۔انہوں نے اپنی کتاب مسلم دور حکومت کا خاتمہ کا حوالہ دیا جس میں کئی غلط پھیلائی جانے والی باتوں کا جواب دیا گیا۔انہوں نے بتایا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی آمد حضرت عمرؓ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔محمد بن قاسم اور ان کے ساتھیوں کے حسن اخلاق اور انصاف سے مقامی عوام بہت متاثر ہوئے۔ جب انگریزوں نے اپنی سازشوں سے ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اس ملک میں ان کے قدم جم گئے۔سلطان ٹیپوؒ اپنی رعایا میں اس قدر مقبول تھے کہ انگریزوں نے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین کی۔ آصف جاہ اول جب دکن آئے تو انہوں نے غیر مسلم وزیر تعین کئے۔لگان کی وصولی کیلئے برہمنوں کا تقرر کیا۔مہی پت رام وشہزادہ مبارز الدولہ نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جب سید احمد شہید کی تحریک آزادی کا ہندو زراء نے ساتھ دیا۔مشہور مورخ تارا چند نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور سید اسمعیل شہیدؒ سیاست کو اخلاقیات سے ملانا چاہتے تھے۔ ہماری جنگ آزادی میں مولانا فضل حق خیر آبادی نانا صاحب مولوی عظیم اللہ بیگم حضرت محل، مہارانی جھانسی نے مل کر قوم کی قیادت کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے راجہ رام موہن رائے کو اپنے وظیفے کی بحالی کیلئے انگلستان روانہ کیا تھا۔نانا صاحب عظیم اللہ خان پر اعتماد کرتے تھے۔تانتیا توپے طرہ باز خان، رانا امر سنگھ جیسے جاں باز ہماری جنگ آزادی میں ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہیں۔ جنگ آزادی میں علماء کے رول کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانا توی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود الحسن وغیرہ کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔صدر جلسہ عبدالرحیم قریشی صدرت تعمیر ملت نے کہا کہ جنگ آزادی میں ہندو مسلم اتحاد عروج پر تھا۔ سراج الدولہ کا ساتھ موہن لال نے دیا تھا۔انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کیلئے تاریخ کو مسخ کیا۔انڈیا آفس لائبریری کے ساتھ فرانس میں بھی پولیس کے کتب خانوں میں جو ریکارڈ ہے اس کی چھان بین کرنے سے کئی حقائق سامنے آئیں گے۔آخر میں فاضل مقرر

نے شکیب جلال کی ایک ولولہ انگیز نظم بھی سنائی۔ جلسہ میں باذوق سامعین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ صدر اقبال اکیڈمی ظہیر الدین ناسازی مزاج کے باوجود جلسہ میں شریک تھے۔ ضیاء الدین نیر کارگزار صدر کے شکریہ پر محفل برخواست ہوئی۔

رسم اجراء ''اقبال اور بمبئی''

مصنف: پروفیسر عبدالستار دلوی

صدارت: محمد عبدالرحیم قریشی صدر تعمیر ملت

اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک خصوصی نشست بصدارت محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت گلشن خلیل مانصاحب ٹینک منعقد ہوئی۔ خصوصی مہمان کے طور پر پروفیسر عبدالستار دلوی اور انور معظم سابق صدر شعبہ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی نے شرکت کی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی کتاب ''اقبال اور بمبئی'' کی رسم اجراء پروفیسر انور معظم کے ہاتھوں انجام پائی۔ مقررین نے کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ جلسہ کا آغاز قرات کلام پاک سے ہوا۔ سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈمی نے کلام اقبال پیش کیا۔ فاطمہ پروین پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اقبال ان عظیم شعراء میں سے ہیں جن کی زندگی ان کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس پر ان کے عقیدت مندوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ پروفیسر دلوی نے مستند ذرائع سے اقبال کی زندگی کے مختلف شعبوں کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر دلوی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اسے وزن اور وقار عطا کیا ہے۔ ان کی کتاب ''اقبال اور بمبئی'' نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ مستند بھی ہیں اور مفید بھی اور مفصل بھی۔ دلوی صاحب نے ہر بات کا حوالہ اور تاریخی حقائق پیش کئے ہیں۔ پوری کتاب اقبال کے لئے سچا خراج عقیدت ہے۔ اس کتاب میں اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع کیا ہے جو ہم کو کہیں اور نہیں ملتا۔ دلوی صاحب نے اسپین کے دورہ کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ سید امتیاز الدین نے اپنے مضمون میں کہا کہ مصنف نے بڑی صاف دلی سے اعتراف کیا ہے کہ اخبار خلافت بمبئی کے شمارے انہوں نے حیدرآباد کے اردو ریسرچ سنٹر سے حاصل کئے۔ اقبال کو جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر بنانے کی گاندھی جی نے خواہش کی تھی لیکن اقبال اس کیلئے راضی نہیں ہوئے۔ اقبال کی انسانی ہمدردی کا ایک واقعہ یہ بھی انہوں نے حیدرآباد کے گل فروشوں کو بہت بڑے نقصان سے بچالیا جو شہزادگان آصفجاہی کی شادی کے بعد ان کے استقبال

کیلئے بمبئی گئے تھے۔ اقبال نے ترانہ ہندی صرف تین گھنٹوں میں لکھا تھا جو 110 سال کے بعد آج بھی ہر ایک کی زبان پر ہے۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف کی اور کہا کہ پروفیسر دلوی نامور محقق ہیں اور انہوں نے بہت مستند کتابیں لکھی ہیں۔ جہاں تک اقبال اور عطیہ فیضی کے باہمی مراسم کا تعلق ہے وہ ایک جذباتی تعلق تھا اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ اقبال ایک محبّ وطن تھے اور ترانہ ہندی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال کا نقطہ نظر نہایت وسیع تھا۔ یہ کتاب نہایت اہم ہے اور اس کی مناسب پذیرائی ہونی چاہئے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں اقبال اکیڈمی کا ممنون ہوں کہ اس کتاب کی رسم اجراء یہاں عمل میں لائی گئی۔ 1987 میں حیدرآباد آیا تھا یہاں عبدالصمد صاحب کی لائبریری سے میں نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کتاب کی اشاعت پر سب سے زیادہ تحسین اور حوصلہ افزائی مجھے حیدرآباد سے ملی۔ تحقیق ایک صبر آزما کام ہے۔ بہرحال اب کتاب سامنے آگئی ہے۔ بمبئی شہر نے سرسید اور شبلی کو بھی متاثر کیا ہے۔ ادب میں پیری مریدی نہیں چلتی لیکن جب ہم کسی سے سیکھتے ہیں تو اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ پروفیسر انور معظم نے تبصرہ نگاروں کے مضامین کی تعریف کی اور کہا کہ یہ جلسہ واقعی رسم اجرء کا حق ادا کرتا ہے۔ عطیہ فیضی نے بالکل سچ کہا کہ اقبال کو ایک انسان کی طرح دیکھنا چاہئے۔ انور معظم نے کہا کہ اردو یونیورسٹی چاہے تو اقبال اکیڈمی کے تعاون سے عملی پراجکٹ پر کام کرسکتی ہے۔ اقبال مسلم معاشرہ میں صحت مند رجحانات کی ترویج چاہتے تھے۔ صدر جلسہ محمد عبدالرحیم قریشی صدر تعمیر ملت نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اس کتاب میں اقبال کی شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ آصفجاہی شہزادوں کی شادی میں مولانا شوکت علی کا اہم رول رہا۔ اقبال تعصب اور تنگ نظری کے سخت خلاف تھے۔ اقبال کے ارشادات آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ یہ ایک قیمتی کتاب ہے اور میں مصنف کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ باذوق سامعین کی کثیر تعداد تھی۔ رات دیر گئے محفل برخواست ہوئی۔

☆☆☆

خودی کا سرِ نہاں لا اِلٰہ الا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فساں لا اِلٰہ الا اللّٰہ

Thus *Khudi* as a core and cult of Iqbal's educational philosophy reveals the fact that education should stimulate the sensibility of hard and unrelenting endavour for life through its course content and instructional methodology, but at the same time his sensitized educational outlook analysis the social and moral ramifications of contemproray concept i.e. 'Education for Earning' alone. He imagines that human potential self is above the considerations of profit and loss heirarchy:

بر تر از اندیشہ سودوزیاں ہے زندگی

Iqbal firmly believed that life is dreary and monotonus aimed at establishment of a peaceful and just society. Therefore his concept of Khudi drives all its resonance and ignites the minds of student commumity as:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

☆☆☆☆

character, it is not determined by our national requirements, it breaks entirely with our past, and appears to proceed on the false assumption that the ideal of education is the training of human intellect than human will.

Therefore, from this specific angle the central point of Iqbal's educational philosophy is the training of human will, in order to consolidate the Khudi in the personality of student. In his lectures, Iqbal has defined the personality of man as a combination of various wills held together by a unity of directive purpose. These varied wills in man constitute all personality aspects, such as biological, socio-biological, socio-cultural, psychological, transcendental etc. The energy and force of all wills in man leads to the fact that various wills have to arrange in such a fashion that the will to God become supreme, overriding will and all other wills are governed and disciplined by it. Professor Asloobe Ahmed Ansari has rightly evaluated the issue as:

> For him (Iqbal) God is not a hypothetical, transcendent, and un approachable Deity but He is conceived in terms of a dynamic creative will.

Thus, Iqbal's man of **Khudi** lives his life in the name of the God, dedicating all his powers to the working out of His increasing purpose on earth. He subordinates everything to God. Evidently, Iqbal's concept of soul, personality, ego or self is therefore, only that kind of man's self-consciousness which is aroused and activated by God-consciousness:

divergence instead of any sort of convergence in the existing educational environment of India. Iqbal asserts that it failed to maintain a healthy equilibrium between the individual and the society. Concentration on inner richness of a student did not materialize, due to casual superficial, mechanical and unilateral approach. He believes that life's progress, develops in an organic form, which our present education lacks absolutely. He says:

> The movement of life, as an organic growth involves a progressive synthesis in its various stages. Without this synthesis it will cease to be an organic growth.

Iqbal contends that in this situation the unfoldment of student's *Khudi* is inimical. In a poem 'Hindi Maktab', he draws the conclusion as following:

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزون نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

Another significant aspect of Iqbal's educational philosophy is the infinite power of man, which consists in his 'will'. The gradual unfoldment of which must be the object of all human activity. In his view, 'A strong will in a strong body is the ethical ideal of Islam'. While making his argument credible, he investigates content and character of the system of education of his period as:

> I venture to say, that the present system of education in this country is not at all suited to us as people. It is not true to our genius as a nation, it tends to produce an un-Muslim type of

and by adjusting himself to it.**Khudi** is thus a dynamic process rather than a static factor. In fact, for Iqbal the individual's isolation from the community is a main obstruction. He is real and so far as he absorbs the purpose of the community and creativily expresses them through his own personality. Iqbal attaches much significance to the Quranic injunction:'Verily, God will not change the condition of men, till they change what is in themselves'.

Iqbal supplements much significance in his educational scheme, to man's ego and its manifestations in his surroundings. In the words of Iqbal:

The life of the ego is a kind of tension caused by the ego invading the environment and environment invading ego. The ego does not stand outside the arena of mutual invasion. It is present in it as directive energy and is formed and disciplined by its own experience.

In a sound system of education Iqbal proposes a continuous and relative interaction between the individual and the environment. It becomes a binding factor for man to take rather an introspective approach to fulfill the aspirations of humankind and determine its destiny, to mould all the forces to his own ideal end and purpose. And in this process of progressive change, God becomes a co-worker with him provided man takes the initiative. There is give and take relationship between the individual and the environment. The individual therefore instead of remaining aloof from the environmental influences and thus becoming egocentric, should have intensive and fruitful contacts with the environment, enrich his mind with the energizing currents of social life. But Iqbal's sensibility observes a state of

fed, better housed and properly educated. Life is not bread and butter alone; it is something more; it is healthy character reflecting the rational ideal in all its aspects. And for a truly national character, you ought to have a truly national education.

In his philosophical scheme, the self-realization does not lead to fulfillment of egoism. This goal actually aims at the realization of those values which are essentially human and social in nature. According to Syed Abdullah, Iqbal's educational philosophy combines knowledge, sense perception, reason and intuition in an integrated form. His genius speculates that light from one direction could not illuminate the whole reality in all its manifestations.

For the cultivation of *Khudi*, which is for him the highest goal of educational effort; he is attracted by *Leibnitz's* idea of monad but unlike *Leibnit's* he held that monad is essentially assimilative in its nature. For Iqbal individuality is not a datum but an achievement.

زشرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے

Professor Asloob Ahmed Ansari observes the same feeling in Galib's poetry. He maintains that for Galib, in each and every thing there is life, energy, activity, impateince, growth and change. This is a continious, steady and interrelated natural process.

ازمہر تابہ ذرہ دل ودل ہے آئینہ

It is man who has the capacity to achieve harmony with the surrounding realities and by mastering the environment

یہ عالم یہ بت خانہ چشم و گوش
جہانِ زندگی ہے فقط خورد و نوش

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخی فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

Iqbal's insightful study of educational environment of his times covers all dimensions in an organic whole and unambiguously determines objectives of an ideal education. He writes:

> *Education like other things ought to be determined by the needs of the learner. A form of education, which has no direct bearing on the particular type of character, which you want to develop, is absolutely worthless. I grant that the present system of education in India gives us bread and butter. We manufacture a number of graduates and then we have to send titled mendicants to government to beg few appointments in the higher branches of service, what then? It is the masses who constitute the backbone of the nation, they ought to be better*

affinity with Him. This also makes man superior to all creation and makes him master not only of animal life but also of the forces of nature itself

Iqbal asserts that '*religion is not a department affair; it is neither mere thought, nor mere feeling, nor mere action; it is an expression of the whole man*'. Noted educationist Jacques Martain, a follower of Bergson's philosophy, also accepts the vital position of religion in education. He says:

The complete and integral idea of man which is the prerequisite of education can only be philosophical and religious idea of man. I say philosophical because the idea pertains to the nature and is the essence of man, I say religious because existential status of this human nature in relation to God.

Creative activity has a paramount importance in Iqbal's concept of *Khudi*. He is in favour of '*permanence of human ego in a profounder personality*'. The movement towards the achievement of a profounder personality, asserts Iqbal, cannot be created in alien frame but in self-frame with new and energetic desires in the world phenomenon:

امتحانِ خویش کن، موجود باش

Besides, education should have higher objective not with lower ambition of earning bread and butter, which has now became primary aim of our present education. Realization of *Khudi* through verifiable educational process explores God-like qualities in man and builds up a world worthy of his habitation. Iqbal's critical faculty catches the problem as:

thesis of Plato and Spinoza that purpose of life is attributed to the issues of life and death alone. He reflects that life and death are not primarily the matter of major concern. Infact, it is the 'Khudi of Man' which requires an organic attention and focus. He criticises both for their divisible interpretation of phenominal and transcendental world and avers that dualism in thought and action negates, self-affirmation, self effacement and meliorism. Otherwise, these quilities prompts a learner for attainment of dynamism and creativity, specifically as an ethical ideal of life. Iqbal clarifies his view point as:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہوا آتشِ ہمہ سوز

یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی و شب روز

Professor G. R. Abdullah assesses the criterion of the educational implication of Iqbal's doctrine of Khudi as:

> *On the examination of Khudi as the overall and ultimate goal of education in Iqbal's perspective, the question that arises now in this connection is related to the content of education, the service of educational objective. Iqbal emphasized the teaching of religion or revelation as its core in the curriculum. He never forgave the omission of God and godliness from the scheme of education according to his philosophy.*

Maulana Azad in his educational ideas elucidates the issue as following :

> As regent of God on earth, man has an immidiate

☆Tariq Masoodi

EDUCATIONAL IMPLICATIONS OF KHUDI:

The Doctrine of Khudi constitutes an over all objective in Iqbal's philosophy of education. He explicitly says that knowledge is an instrument for the preservation of life. Knowledge is a means of establishing the self:

علم از سامانِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

Within the parameters of this doctrine he imagines the role of education. Obviously, Iqbal was in search of an ideal man or Mard-i-Mumin, whom he perceives, must be the embodiment of all qualities, which he has defined quite eloquently in his doctrine of Khudi. He considers education as dynamic factor in making the man of his own imagination. Iqbal's philosophy of Khudi reveals the fact that he had an uncompromising faith in man's individuality. Ishq broadens his intellectual horizon, Faqr consolidates his indiscriminating zeal towards his fellow beings. Desire explores the possibilities of novel dimensions of life. Freedom would make him formulator of his own destiny. Infact, all such dynamic factors in the eyes of Iqbal strengthen and consolidate man's glorious individuality and lead him towards attainment of purpose of life. The educational implications of Iqbal's doctrine of Khudi can be well understood, when he devoted one part of his poetic collection Zarb-i-Kalim to explain the essence of education entitled, 'Taleem-o-Tarbiyat', with Khudi as its focus. In its opening remarks Iqbal denouces the

☆Dr. Tariq Masoodi, *P.G. Deptt. of Education, MANUU, Hyderabad - 32*

IQBAL REVIEW

April 2013

English Section

Vol : 23 Issue : 1
April 2013

ISBN:81-86370-54-4

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)
April 2013

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank, Hyderabad - 28, A.P. INDIA.